ISSN-1817-6380

SDPI
Sustainable Development Policy Institute

پائیدار ترقی

جلد نمبر 17، شمارہ نمبر 1 جولائی۔دسمبر 2018ء

پالیسی انسٹیٹیوٹ برائے پائیدار ترقی

10۔ڈی ویسٹ، 3rd فلور، تیمور چیمبرز، فضل حق روڈ، بلیو ایریا، اسلام آباد، پاکستان
فون: 051- 2278134/2270674 ، فیکس:051-2278135
ای میل: main@sdpi.org ویب سائٹ: http://www.sdpi.org/
پوسٹ بکس نمبر 2342، اسلام آباد، پاکستان

پائیدار ترّقی

پالیسی انسٹیٹیوٹ برائے پائیدار ترقی (ایس ڈی پی آئی) کا ششماہی مجلّہ
جلد نمبر۔17 شمارہ نمبر۔ 1
جولائی تا دسمبر 2018ء
قیمت فی شمارہ (پاکستان):500روپے، سالانہ چندہ 1000روپے
قیمت فی شمارہ (بیرونِ ملک):10امریکی ڈالر، سالانہ چندہ:20امریکی ڈالر

پائیدار ترقی ایک تحقیقی مجلّہ ہے جس کا مقصد ترقیاتی برادری، نجی شعبہ، سرکاری اداروں اور اس مسئلے سے دلچسپی رکھنے والے شہریوں کو اپنی تحقیقی کاوشوں اور پائیدار ترقی کے حوالے سے، اپنی جدوجہد سے آگاہ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اپنے قارئین کو معاشرے، ماحول اور ترقی کے حوالے سے اہم تحقیقی پیش رفتوں سے بھی باخبر کرتا رہے گا۔

ادارتی بورڈ:
ڈاکٹر عابد قیوم سلہری، سلیم خلجی، شفقت منیر، احمد سلیم
نگران : احمد سلیم
مدیر : ڈاکٹر حمیرا اشفاق
تزئین و آرائش : شاہد رسول، علی عامر جاوید

پالیسی انسٹی ٹیوٹ برائے پائیدار ترقی (ایس ڈی پی آئی)
10-D ویسٹ، تیمور چیمبرز، 3rd فلور، فضل الحق روڈ، بلیو ایریا، اسلام آباد
فون :051-2278134/2270674-76 ، فیکس:051-2278135
ای میل:main@sdpi.org، ویب سائٹ:http://www.sdpi.org/
پوسٹ بکس نمبر 2342، اسلام آباد، پاکستان

فہرست

1۔	مسلم سوچ میں ہیجان	اے۔جی نورانی	05
2۔	سائیبر سیکورٹی اور سائیبر جنگ: پاکستان کہاں کھڑا ہے	بریگیڈیئر (ر) محمد یاسین	37
3۔	چین کے قومی سطح پر بنائے گئے مقامی نمائشی زون (NIIDs) کے دورے کے لیے سائنسدانوں، محققین اور میڈیا (سائنسز) کے وفد میں ایس ڈی پی آئی کی شمولیت	ادارہ	57
4۔	شنگھائی میں جنوبی ایشیاء اور چین کے موضوع پر کانفرنس	ادارہ	62
5۔	سماجی احتساب	جوناتھن فوکس	63
6۔	شاہ: کل اور آج	احمد سلیم	81
7۔	محمدی بیگم کے ناولوں میں خواتین کے معاشرتی رویوں کی عکاسی	ڈاکٹر حمیرا اشفاق	91

مسلم سوچ میں ہیجان

اے۔جی نورانی

خلاصہ

(اس مضمون میں مسلم دنیا میں علمی ہیجان پر گفتگو کی گئی ہے جو اس صورت حال سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل اور توجہ اپنے جانب مبذول کراتا ہے "سیاسی اسلام" کہتے ہیں۔مصنف)

"تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان افراد کی حالت آج تک کبھی نہیں بدلی جب تک کہ وہ خود اسے تبدیل کرنے کی سعی نہ کریں"۔قرآن مجید (13:11)

اپنے دین کے بارے میں مسلمانوں کی سوچ 19ویں صدی کے آخر اور 20ویں صدی کے ابتدائی دور سے تعلق رکھنے والے معذرت خواہانہ رویے کے حامل عناصر سے کہیں زیادہ بلند ہوئی ہے؛ یہ وہ مرحلہ تھا جب یہ عناصر برنارڈ شا اور ویلز کی طرف سے کی جانے والی اسلام کی تعریف کے تواتر سے حوالے دیتے تھے۔سید امیر علی کی تصنیف "روح اسلام" اپنی نوعیت کی کلاسیکی تصنیف ہونے کے باوجود عذر خواہی کا نمونہ ہے جبکہ مولوی چراغ علی کی کتاب "عوامی جہاد کی تنقیدی تشریح" نے مغربی مصنفین اور متعصب مسلمان دانشوروں کی یکساں طور پر تردید کی ہے۔انہوں نے مسلمانوں کی سوچ اور عمل میں اصلاح کا درس دیا ہے جو اپنے وقت سے بہت آگے تھا۔2012ء میں ہمیں جنوبی ایشیائی خطے میں ایسی آوازیں سنائی نہیں دیتیں؛ بالخصوص انڈیا میں تو کوئی بھی نہیں۔یورپی شہنشاہیت کے حملوں،

یورپی افکار، ثقافت اور بلاشبہ یورپی فتوحات سے بہت پہلے اسلامی دنیا علمی جمود کا شکار ہو چکی تھی۔ اس صورتحال میں افکار کے دو متضاد رجحانات سامنے آئے۔ احیاء جس کی پیداوار جدید بنیاد پرست ہیں اور مذہب کے بارے میں حقیقت پسندانہ سوچ؛ وہابی پہلے رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جب کہ سر سید خان اور ان کے رفیق کار چراغ علی دوسرے رجحان کے نمائندے ہیں۔ دونوں کے پیشرو عظیم عالم دین شاہ ولی اللہ دہلوی (1703-1762) ایک سوانح نگار کے مطابق ''معقولیت اور حقیقت پسندی ان کے افکار کی نمایاں خوبیاں ہیں۔'' (اللہ دتہ مضطر: شاہ ولی اللہ: عالم اسلام کے ایک درویش دانشور: تاریخ وثقافتی تحقیق پر قومی کمیشن، اسلام آباد 1979ء، صفحہ 83) اس سوچ کی بنیاد اسلامی افکار میں ہے اور معتزلہ اس کی ایک مثال ہیں۔

عدم موزونیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس مضمون میں مسلم دنیا میں علمی ہیجان پر گفتگو کی گئی ہے جو اس صورت حال سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل اور توجہ اپنی جانب مبذول کراتا ہے جسے ''سیاسی اسلام'' کہا جاتا ہے۔ یہ ایک نمائندہ سروے نہیں ہے چہ جائیکہ یہ حتمی ہو۔ یہ ایسے مسائل کی وضاحت پر مبنی ہے جنہیں حل کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ مغرب ان کے بارے میں حساس نہیں ہے اور نہ ہی جنوبی ایشیاء ان پر توجہ دے رہا ہے۔ ''عرب بہار'' کے قائد ملک تیونس میں النہادہ پارٹی نے مخلوط حکومت تشکیل دی ہے۔ اگر چہ اس نے انسانی حقوق اور صنفی مساوات کے احترام کا وعدہ کیا ہے لیکن اس کی فتح نے خطرے کی گھنٹی بہر طور بجادی ہے کہ ''بنیاد پرست دروازوں سے اندر داخل ہو گئے ہیں۔'' اور ایسا صرف اس کے رہنماؤں کے پس منظر کی وجہ سے ہوا ہے۔ 1987ء میں راشد الغنوشی نے صدر حبیب بورقیبہ کے دور میں دلیری سے سٹیٹ سیکورٹی عدالت کا سامنا کیا اور اس عدالت سے عمر قید کی سزا پائی۔ 1988ء میں حکوت کا تختہ الٹے جانے کے بعد انہیں معافی دے کر جلاوطن کر دیا گیا۔ دریں اثناء اسلامی رجحان کی تحریک حزب النہد (جسے مغرب النہادہ کہتا ہے) نے 1987ء کے انتخابات میں قومی سطح پر 13 فیصد اور دیہی علاقوں میں 30 سے 40 فیصد تک ووٹ حاصل کئے۔ الغنوشی نے اقبال کی تصنیف اسلام میں مذہبی اعتقادات کے احیاء کا مطالعہ کر رکھا تھا لہٰذا وہ اعتماد کے ساتھ مغربی ناقدین کا سامنا کر سکتے تھے۔ دیگر مشاہیر میں سے وہ ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب سے بھی متاثر تھے تاہم دونوں سے اختلاف کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''مسئلہ یہ ہے کہ معاشروں نے ارتقاء کیا ہے جبکہ اسلام پسندوں نے ایسا نہیں کیا''۔ ان کا کہنا ہے کہ ''اسلام میں شوریٰ (مشاورت) کا تصور جمہوریت میں انتخابات، پارلیمانی نظام اور اختیارات کی تقسیم وغیرہ سے مکمل ہم آہنگ ہے اور شوریٰ کے نفاذ کے لئے انتہائی موزوں ہے۔'' اتفاق رائے (اجماع) اسلام میں جمہوریت یا شراکتی حکومت کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ غنوشی کو

یقین تھا کہ مغرب کی طرح اسلامی دنیا میں بھی جمہوریت کئی شکلیں اختیار کر سکتی ہے۔ وہ حکومت کے کثیر الجماعتی نظام کے حامی تھے۔ ''غنوشی قانون کی حکمرانی، آزادی اور انسانی حقوق کو تہذیب کے لازمی اجزاء سمجھتے تھے۔ یہ یقین کرنا کہ یہ اجزاء اسلامی دنیا کے بجائے صرف مغرب میں پائے جاتے ہیں، وہ کہا کرتے تھے کہ وہ ایسے سیکولر ملک میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں جہاں آزادی ہو کیونکہ یہ اس ملک سے بہت ہے جہاں سرکاری قانون شریعت ہو مگر وہاں آزادی نہ ہو۔ اس بات پر بحث کرتے ہوئے کہ کہ ایک مسلمان یورپ یا امریکہ جیسے غیر مسلم ملک میں رہ سکتا ہے، غنوشی کہتے ہیں کہ کوئی بھی سیکولر جمہوری ملک جہاں مذہبی آزادی موجود ہو (چاہے وہ دارالسلام ہو یا دوسری قسم کا ملک) بجائے اس کے کہ وہ دارالحرب ہو۔''

انہوں نے یقین ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ''جمہوریت کا مطلب مغرب کی طرز کا موجودہ حکومتوں کا معتدل نمونہ ہے جس نظام کے تحت عوام آزادانہ طریقے سے اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں اور جس میں اقتدار کا متبادل موجود ہوتا ہے۔ اس میں عام آدمی کے لئے آزادیاں اور انسانی حقوق ہوتے ہیں۔ اس صورت میں مسلمانوں کو اپنے مذہب میں کوئی ایسی چیز نہیں ملے گی جو جمہوریت کے مخالف ہو اور ایسا کرنا کسی بھی طرح سے ان کے مفاد میں نہیں ہے۔'' یہ بات انہوں نے جان۔ ایل السپوسیتو اور جان۔ اووال کے ساتھ انٹرویو میں کہی (معاصر اسلام کے بنانے والے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس 2001ء، صفحہ 114)

مصنفین کے مطابق ''اگرچہ مسلم جمہوریت کی بنیاد مساوات اور آزادی پر ہے تاہم اس کا اسلامی کردار اداروں پر حدود مقرر نہیں کرتا نہ اثر و رسوخ استعمال کرتا ہے۔ غنوشی کے مطابق جدید ریاست کی شہریت ایسی ہونی چاہئے جس میں سب مسلم اور غیر مسلم ایک مشترکہ قومیت کے ساتھ مساوی ہوں۔ غنوشی کا کہنا ہے کہ اسلام اس حقوق (قرآن وسنت اور اسلامی فقہ) کی ضمانت دیتا ہے اگرچہ وہ مانتے ہیں کہ ذات، رنگ، نسل اور خاندان سے قطع نظر سب برابر ہیں، ان کے حقوق اور آزادیاں برابر ہیں۔ لیکن وہ روایتی اسلام کے مطابق غیر مسلموں کو ''ذمی'' بھی سمجھتے ہیں اور اس طرح شہریت کی دو اقسام سامنے آجاتی ہیں۔ مسلمانوں کو خصوصی شہریت حاصل ہوتی ہے اور اکثریت دوسروں کی زندگی پر اپنے مذہبی اثر و رسوخ کا استعمال کر سکتی ہے۔ اس طرح ریاست غیر مسلموں کے لئے اعلیٰ حکومتی عہدے ممنوع قرار دے سکتی ہے'' (ایضاً 215)۔ خیالات کا یہ پہلو ہے جسے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

''غیر اسلامی حکومت میں اسلام پسندوں کی شراکت'' کے موضوع پر ان کا مقالہ ایک اور پہلو پیش کرتا ہے (جان ایل دونھوئے اور جان ایل السپوسیتو: اسلامی تبدیلی: مسلم نکتہ نظر آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ دوسرا ایڈیشن 2007ء)۔

مسلمان ایسی حکومتوں میں شامل ہو سکتے ہیں۔''سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے قوانین کے نفاذ کی سرگرم اور تعمیری کوششیں جاری رکھ سکتے ہیں، یہ نفاذ جزوی ہو یا مکمل، اس کا انحصار حالات اور وسائل پر ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ کے قوانین کا جوہر، جس کے لئے تمام الہامی پیغامات ارسال کئے گئے، انسانیت کے لئے قیام انصاف ہے۔۔
''ہم نے وقتاً فوقتاً اپنے پیغمبر بھیجے واضح علامات کے ساتھ، انہیں کتاب اور توازن (غلط اور صحیح کے امتیاز) کے ساتھ بھیجا تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ کھڑے ہوں۔''(57:25)

تاہم اس بات پر زور دیا جانا چاہئے کہ اقتدار میں شراکت کو درپیش مسئلہ اسلام پسندوں کو اقتدار میں شرکت، اجتماعیت اور جمہوریت کو تسلیم کرنے پر آمادہ کرنے کی شکل میں پوشیدہ نہیں ہے۔اسلامی حلقوں میں موجود عمومی رجحان شراکت اقتدار کو اختیار کرنے کا ہے چاہے وہ سیکولر قسم کی حکومتوں کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو اور اس کا مقصد دوطرفہ اہداف کا حصول ہوتا ہے جن میں قومی یکجہتی، انسانی حقوق کا احترام، شہری آزادیاں، ثقافتی، سماجی اور معاشی ترقی اور بیرونی خطرات کا مقابلہ شامل ہیں۔

''اصل مسئلہ ''دوسروں'' کو آمادہ کرنے میں پوشیدہ ہے، ان میں برسر اقتدار حکومتیں، عوام کی خودمختاری کا اصول اور اسلام پسندوں کا حق بھی دوسرے سیاسی گروپوں ہی کی طرح ہونا ہے۔وہ بھی سیاسی جماعتیں تشکیل دے سکتے ہیں، سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتے ہیں اور جمہوری طریقوں سے حصول اقتدار کی دوڑ میں شریک ہو سکتے ہیں۔
''(صفحہ 278)

حیرت کی بات یہ ہے کہ ان پر تنقید خود ان کے قریبی رفیق کار تیونس کے دانشور محمد شرفی نے اپنی معروف کتاب ''اسلام اور آزادی: تاریخی غلط فہمی (زید بکس، لندن:2005ء) میں کی۔انہوں نے ۔۔شاید بلا جواز۔۔ الزام لگایا کہ ''غنوشی نے جمہوریت کے لبادے کے نیچے آمریت کے لئے ترجیح کو چھپا رکھا ہے۔''(صفحہ 19)، انہوں نے الزام لگایا کہ غنوشی کی ''المعارفہ'' نے اپنے آخری برسوں میں خواتین کے کردار کو گھریلو امور تک محدود کر دیا تھا''۔ (صفحہ 31)۔شرفی ایک طالب علم رہنما، قانون کے پروفیسر، حقوق انسانی کے کارکن اور وزیر تعلیم تھے۔ان کی تصنیف کلاسیکی اہمیت کی حامل، دلیرانہ اور جرأت مندانہ ہے۔یہ مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی طرف سے اسلام کے بارے میں تاریخ غلط فہمی پر سب سے زیادہ بے لاگ تجزیہ ہے۔تیونس میں قانون کے پروفیسر کی ملازمت کے دوران انہوں نے ''تناظر'' کی تشکیل میں مدد دی جو ایک ترقی پسند جمہوری اپوزیشن گروپ تھا۔اس معاونت کے نتیجے میں انہیں دو سال قید کی سزا دی گئی۔انہوں نے ایک اصلاح پسند وزیر تعلیم کے طور پر خدمات سرانجام دیں لیکن

اپنی متعارف کرائی گئی اصلاحات کے حوالے سے اپوزیشن کے خلاف سیکورٹی فورسز کی زیادتیوں کے خلاف احتجاجاً مستعفی ہو گئے۔ تیونس میں 19ویں صدی کے دانشور بہرام جیسے علماء نے اصلاحات کی شمع روشن کی تھی۔ ان کی مختصر سی کتاب میں اتنے جامع اور زبردست تجزیے حیران کن ہیں۔ یہ کتاب فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی۔ جس کا انگریزی میں ترجمہ پیٹرک کیمپلر نے کیا۔ اس کتاب میں فرانسیسی زبان میں لکھنے والے عرب اور یورپی دانشوروں کے بہت زیادہ حوالے دیئے گئے جو عام طور پر انگریزی کتابوں میں نہیں ملتے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ اس کا اردو ترجمہ کر کے انڈیا اور پاکستان میں اس کی وسیع پیمانے پر تقسیم کی جائے گی۔ مصنف کے تجزیوں کی بنیاد قرآن مجید پر ہے۔

ہر مرحلے پر مسئلے کا دلیری سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ ''اسلام ارتقاء کے معاملے میں عیسائیت اور یہودیت کے مقابلے میں کسی طرح بھی کم صلاحیت کا حامل نہیں ہے۔ لیکن گذشتہ چند صدیوں کے دوران یورپی اقوام نے ٹیکنالوجی، معیشت، ثقافت اور سیاسی شعبوں میں اہم تبدیلیاں کر کے زبردست کامیابیاں حاصل کی ہیں جب کہ مشکلات و مصائب کی وجہ سے مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں پسماندگی کا شکار ہوئے ہیں۔ یہ ان کا دائمی مقدر نہیں ہے اور ان کے لئے بہت ممکن ہے کہ وہ اس خلیج کو پاٹ سکیں۔'' (صفحہ 4)

وہ لکھتے ہیں کہ ''سال ہا سال سے من پسند موروثی نظام، جو کہ مقدس سمجھا جاتا ہے، سکولوں کے ذریعے پڑھایا جاتا ہے اور نئے نظام، جسے غیرملکی درآمد اور اسلام کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ کے درمیان خلیج وسیع ہوتی جارہی ہے۔ یہ ایک اہم اختلاف ہے جو عوام کو منتشر کر کے رکھ دیتا ہے اور انہیں ایک ایسی سوچ کے دہانے پر لا کھڑا کرتا ہے، جہاں وہ اسلام اور جدیدیت میں سے کسی کو بھی قربان نہیں کر سکتے۔ وہ اسلامی مذہب سے اتنے ہی وابستہ ہوتے ہیں جتنے جدید ریاستی ڈھانچے سے، اور اس کے بارے میں وہ اصرار کرتے ہیں کہ یہ حقیقی طور پر جمہوری اور نمائندہ ہونا چاہئے۔ (صفحہ 5-6)

سیاسی اسلام پسند تصوراتی تاریخی اسلام چاہتا ہے جو جدیدیت پر غالب آسکے جب کہ جدیدیت پسند اسلام فہمی حتیٰ کہ جدیدیت کو سمجھنے کے علمی چیلنج کے سامنے بھی کم ہی کھڑے ہو پاتے ہیں۔ ''کوئی بھی قابل بھروسہ جوابی راستہ'' بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کے درمیان ایسا نہیں ہے۔ زیادہ تر روایتی سوچ پر یقین رکھتے ہیں۔ عام مسلمان کے لئے گھر میں سیکھے ہوئے دین، حقیقت پسندی اور سکول کالج میں حاصل کئے گئے علم کے درمیان عدم رابطہ بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ وہ ایک اچھا مسلمان بننا چاہتا ہے اس کے باوجود منبر سے جس اسلام کی تبلیغ ہوتی ہے وہ اس کے لئے اجنبی بلکہ زیادہ تر غیر متعلق ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ چالیس برس قبل مصنف نے واشنگٹن ڈی سی کے ایک اسلامی مرکز

ملا جبکہ ممبئی میں ہائی کورٹ کی قریبی مسجد میں دیا جانے والا جمعے کا خطبہ بڑا مایوس کن تھا۔ میں جمعہ کا ایک حوصلہ افزاء خطبہ سنا تھا۔اس سے ذرا کم سطح کا حوصلہ افزاء خطبہ اگلے جمعہ کو لندن کی ایک مسجد میں سننے کو

اگر مسلم ممالک میں آمرانہ ریاست آزادانہ بحث پر قدغن لگاتی ہے تو یہی کام ایسے ممالک میں جاہل اور متعصب ملّاں مسلم سیاستدانوں کے ساتھ مل کر کرتے ہیں جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہوتی ہیں۔ چاہے مسلمان معاشی طور پر کتنے ہی متمون کیوں نہ ہوں، آزاد فکر اور کھلے بحث ومباحثے کے بغیر مسلم معاشرہ علمی اور اخلاقی انحطاط کا شکار ہی رہے گا، وہاں جمود ہوگا تو یہ معاشرہ ترقی نہیں کر سکے گا۔انڈین ملّاؤں کے پاس نوجوان مسلمانوں کو دینے کے لئے اس وارننگ کے سوا کیا ہے کہ اسلام اور جدیدیت کا کوئی مقابلہ نہیں ہے؟

مسلمانوں پر جو چیز اثر انداز ہوتی ہے وہ عناصر کے تضادات ہیں۔''ان میں ایک قسم کا احساس جرم ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت جدّت پسند اور مسلمان ہیں؛ اس سے وہ اپنے عمل کی وضاحت میں جھجک محسوس کرتے ہیں۔انہیں پالیسیوں کا دفاع کرنے اور ایک زیادہ مؤثر مؤقف اپنانے میں مشکل ہوتی ہے۔مسلمان دانشوروں کا یہ فرض ہے کہ وہ یہ اہم اور ضروری خدمت سرانجام دیں مگر وہ اس میں ناکام ہوگئے ہیں۔(صفحہ 12)

محمد شرفی دین اسلام سے وابستگی، علم وفضل، علمی دیانت کے عزم پر قائم ایک حوصلہ مند شخصیت ہیں۔نوآبادیاتی دور قابل مذمت ہے لیکن تیسری دنیا یہ بھول جاتی ہے کہ اپنی اس صورت حال کی یہ خود ذمہ دار ہے۔ان کے اندرونی تنازعات اور پسماندگی ہی اس نوآبادیاتی دور کا سبب بنی تھی۔غیر ملکی زبانوں کے سیکھنے، سائنس اور ٹیکنالوجی سے انکار نے پسماندگی کو یقینی بنا دیا۔یورپی نشاۃ الثانیہ عربوں کی ممنون احسان ہے جنھوں نے ترجمہ کر کے یونانی فلسفے اور سائنس میں گرانقدر اضافے کئے بصورت دیگر وہ ختم ہوگئے تھے۔پہلے فرانسیسی پوپ اور عرب۔اسلامی تہذیب کو پسند کرنے والے سلویسٹر دوم نے 10 ویں صدی میں یورپ میں عرب علم الاعداد کو متعارف کرایا۔

شرفی کا یہ کہنا درست ہے کہ''اسلامی دائرے سے باہر انسانی ذہن کی تخلیق کی ہوئی ہر چیز حتیٰ کہ اسلام کے اندر بھی حضور اکرم ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کے ادوار کے بعد کے عناصر سے انکار نے جمہوریت اور جمہوری رویوں کو مسترد کرنے کا رجحان مستحکم کیا۔(صفحہ 32)

شرفی کہتے ہیں کہ''بنیاد پرستی کے بارے میں کوئی چیز حتمی نہیں ہے اور اس میں جو چیز ملوث ہے وہ مذہب کا معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ ثقافت اور تعلیم کا مسئلہ ہے۔دراصل ہمیں مسلمانوں اور اسلام پسندوں میں امتیاز کرنا چاہئے۔''بنیاد پرست مسلمانوں کو یہ ہدایت کرتے ہیں کہ''نیکی کریں اور برائی سے اجتناب کریں''۔اس نعرے کے تحت وہ ریاست سے

باہر کی قوت پر قبضہ کرتے ہیں لیکن دین کے ساتھ ان کا کوئی حقیقی مفاد وابستہ نہیں ہوتا کیونکہ قرآن مجید میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ ''ہر شخص اپنے کاموں کا پھل پائے گا: کسی روح پر دوسرے کا بوجھ نہیں ہوگا۔ آخر میں آپ اپنے خالق کی طرف لوٹ جائیں گے اور وہ تمہارے تنازعات حل کرے گا۔'' (6:158)

اگر اسلام اور قانون کا باب انڈیا کے لئے انتہائی متعلق ہے تو پاکستان پر اسلام اور ریاست کے اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔ دونوں مل کر بہت سی تخلیقات کی بنیاد رکھتے ہیں۔ دستاویزات میں ان سے انکار نہیں ہوسکتا اور اس کی تردید تباہ کن ہوسکتی ہے۔

ارتداد پر غور کیجئے۔ ''ارتداد پر قرآن مجید میں ان کے ضابطوں کے مطابق کسی بنیاد کے فقدان کی وجہ سے علماء نے اس مسئلے کو حدیث سے منسلک کر دیا، جو کوئی مذہب میں تبدیلی کرتا ہے، اس کو قتل کر دو!۔ تاہم مذکورہ حدیث، احادیث کی ضعیف قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ (جسے صرف ایک شخص نے روایت کیا ہو) اور یہ شک اس وقت زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے جب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ جس صحابی یعنی ابن عباس نے اسے روایت کیا ہے اور ان کی عمر حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات طیبہ میں صرف 13 برس تھی اور اسے کندی نے بیان کیا ہے۔ جب پیغمبر اسلام ﷺ کو آخر الذکر کے بارے میں معلوم ہوا، اس نے اس کا الزام اپنے چار بادشاہوں (قمد، میواس، مصرع اور عبدہ) پر عائد کر دیا۔ اس کے لئے یہ ایک کافی جائز ردعمل تھا۔ تاہم اس کے خلاف جنگ یا اسے سزا دینے کا سوال کبھی اٹھا۔ ایسا صرف آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد ہوا کہ کندی کے خلاف جنگ کی گئی تا کہ ان کی بغاوت کو روک کر انہیں واپس دائرہ اسلام میں رہنے پر مجبور کیا جاسکے۔''

ماضی کے تین نکات ہیں جنہیں مسلمانوں کو مسترد کرنا چاہئے۔ احساس سے عاری شریعت جو قرآن سے متصادم ہے: ''اسلامی ریاست'' کا نظریہ جس کی قرآن حمایت نہیں کرتا اور جو تاریخ میں کبھی موجود نہیں رہی؛ اور جہاد جو کہ اس تصور کے منافی ہے جس پر قرآن میں زور دیا گیا ہے۔

اسلامی دنیا میں کسی اصلاح کے لئے دیانتداری کے ساتھ ان چار امور پر عمل ضروری ہے؛

(1) بعض قرآنی آیات کی تشریح عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق کرنا ہوگی تا کہ دوسروں کی مخالفت میں ان پہلوؤں کو مدنظر رکھا جاسکے جو دائمی اہمت کے حامل ہیں۔

(2) ضعیف احادیث کو الگ کر دینا

(3) علماء کی اتھارٹی کو مسترد کرنا

(4) تاریخ میں اسلام کی زبردست پذیرائی بالخصوص پہلے چار خلفائے راشدینؓ کا کردار جو اسلام سے قرآن میں ممتاز کیا گیا ہے۔

پیغمبرﷺ کی رحلت کے ایک صدی بعد احادیث جمع کرنے کا کام شروع ہوا۔قرآن مجید کے استناد اور ہمہ آہنگی میں ذرہ برابر شک نہیں کیا جا سکتا لیکن احادیث کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت 8 جون 632ء کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔احادیث نبوی جمع کرنے والوں میں سب سے معتبر نام امام بخاری ہے جو نہایت معتبر اور متبرک مقام کے حامل تھے۔ان کی پیدائش نویں صدی میں ہوئی (ہجری کے 194، ان کا انتقال 256 میں ہوا) وہ باقاعدہ طریقے سے کام کرنے والے تھے۔انہوں نے 600,000احادیث جمع کیں لیکن 7,275 کو محفوظ کیا اور دوبارہ جمع ہونے والی 4,000 حدیثوں کو حذف کردیا۔

''اس طرح آنحضرت ﷺ کے انتقال کے دو صدی سے بھی کم عرصے میں 596,725 جھوٹی احادیث پہلے ہی جمع ہو چکی تھیں۔'' ایک سلطان نے امام بخاری کو بلوا بھیجا کہ وہ تخلیے میں کچھ احادیث کے بارے میں ان سے جاننا چاہتا ہے لیکن امام بخاری نے اس کے نمائندے سے کہا کہ ''جاؤ اپنے آقا سے کہو کہ میں علم کا بے حد قدردان ہوں، میں سلطانوں کے درباروں میں جانے سے انکار کرتا ہوں۔'' اگر ان جیسی اصابت اور پختگی رکھنے والے دیگر افراد بھی ہوتے تو آج اسلام کی تاریخ مختلف ہوتی۔

شرفی بجا طور پر کہتے ہیں کہ ''قرآن واحد ذریعہ ہے جو اس قسم کی تنقید سے محفوظ ہے'' مجموعی طور پر 22 سال کے عرصے میں 6,236 آیات نازل ہوئیں 12 مکّہ میں اور باقی 200-500 تک آیات قانون جیسے ضوابط پر مشتمل ہیں۔

معتزلہ ایسے علماء تھے جن کا مکتب فکر آٹھویں صدی کے وسط میں بہت اہمیت اختیار کر گیا کیونکہ ان کی تحقیق میں معقولیت کا کردار کلیدی تھا جب کہ ان کے خلاف وہ لوگ تھے جو اپنے نئے قوانین کی تخلیق میں تسلسل کے ساتھ احادیث کے حوالے دیتے تھے۔معتزلہ نے قرآن کی تفسیر ہمیشہ عقل اور معقولیت کے حوالے سے کی۔انہوں نے معقولیت کو ہر مذہبی قانون کا معیار بنایا۔اس طرح وہ نہایت جرأت مندانہ قانونی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔826ء میں انہیں کافر قرار دیا جانے لگا۔ان کی تصانیف مکمل طور پر تباہ کردی گئیں۔ یہ صرف گذشتہ صدی یا اس سے کم عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ان کی تحریریں دوبارہ دریافت ہوئیں جس کی وجہ سے ان کی تحریروں تک ہماری رسائی ہوئی۔''معتزلہ کو تباہ کرنے سے انعکاس کی روح پر جعلسازی کی روح غالب آ گئی تھی۔'' اور اجتہاد، جو بجائے

خود اسلامی قانون کا ذریعہ ہے، کے دروازے بند کردیئے گئے تھے۔
شرفی جیسے مسلم مفکرین قرآن کو اس طرح پڑھ کر کہ جس طرح اسے پڑھنے کا حق ہے، کی مخلصانہ کوششوں کے ذریعے ان بند دروازوں کو دوبارہ کھولنے کے لئے کوشاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے خطاؤں سے پاک کلام کو کئی صدیوں تک خطا کار غلط انداز سے پڑھتے رہے اور متعدد واقعات میں متعصب ملاؤں نے انسانوں کے ذہن کو متاثر بھی کیا۔ ''ابن خلدون نے احادیث کی کم پیش آٹھ اقسام کی نشاندہی کی ہے جو سب سے زیادہ قابل بھروسہ سے سب سے زیادہ مشکوک اقسام پر محیط ہیں۔ ابن حنبل، جو سب سے مطیع مصنفین میں سے ایک ہیں، نے اپنی فہرست میں پچاس ہزار احادیث احادیث شامل کیں۔ ابو حنیفہ، جو مساوی کلاسیکی لیکن اعتدال پسند مکتب فکر کے بانی ہیں، نے بھی 17 ہزار کے قریب احادیث لکھی ہیں۔ اب کئی صدیاں ہوگئی ہیں اہل سنت کے علماء صحیحین میں شیخین یعنی امام بخاری اور مسلم کی روایت کردہ احادیث کو قابل بھروسہ اور مستند مانتے ہیں جنہیں معقول وجوہات کی بناء پر پیغمبر اسلام ﷺ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ عبدالماجد شرفی نے ایسے کئی بیانات جمع کئے جنہیں وہ ''متنازعہ احادیث'' کہتے ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث غروب آفتاب سے متعلق ہے جسے شیخین نے بیان کیا ہے۔؛ ہر شام سورج خود کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کرنے جاتا ہے؛ یہ اجازت طلب کرتا ہے۔۔۔ اسے اجازت نہیں ملتی اور واپسی کا کہا جاتا ہے۔۔ ایسے ہی معنی ایک آیت کے بھی ہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ ''سورج بھی جو ایک متعین مقام تک اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔''

''اگر اس قسم کی احادیث کو مستند سمجھا جانے لگے تو پھر ہم دوسری بالخصوص ایسی احادیث کو کیسے قابل بھروسہ سمجھ سکتے ہیں جو متنازعہ ہیں؟ قوانین کی تدوین میں جہاں قابل بھروسہ اور جامع نصابوں سے بھی بعض اوقات مختلف نظریات اور عملی نتائج جنم لے لیتے ہیں، ہم ایسے نصاب کیسے تیار کر سکتے ہیں جو منتشر اور غیر یقینی ہوں۔ اس طرح اگرچہ مجموعی طور پر احادیث، مذہب کی بطور روحانیت تفہیم کا ایک مفید ذریعہ ہیں اور حیات بعد الموت کے حوالے سے وعدہ کرتی ہیں یا یہ معاشرے میں انفرادی اخلاقیات اور رویے کے عمومی رہنما اصولوں کے اشارے ہیں، تو یہ قانون کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ ماہرین قانون کو مستند اور جامع نصابوں کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ وہ اپنے نظریات کی تشکیل کر سکیں اور ایسے ضوابط وضع کر سکیں جو قابلِ اطلاق ہوں۔ قرآن وہ واحد ذریعہ ہے جو اس قسم کی تنقید سے محفوظ ہے۔''

یہ اقبال کی عظمت کی علامت ہے کہ شرفی نے صنفی مساوات پر ان کا حوالہ دیا ہے۔ وہ اس نکتہء نظر کے حامی ہیں کہ اسلام اور جدیدیت ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہیں، نہ اسلام اور جمہوریت ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ لیکن

جدیدیت برقیبہ اور مصطفیٰ کمال جیسے آمروں کے دور میں پنپ نہیں سکتی۔اس لئے ترکی اور تیونس میں حالیہ ردعمل دیکھنے میں آیا۔''جدیدیت کے نام پر قائم آمریت بجائے خود جدیدیت کو مشکوک بنا دیتی ہے۔اسلامی ممالک صرف جمہوری بحث کے ذریعے پیشرفت کرنے کے قابل ہوں گے جن میں تمام رجحانات کے پیروکار بشمول اسلام پسند حلقوں کے، آزادی سے حصہ لے سکیں۔اسی طرح بہت سے سیاسی رہنماؤں کے احساسات عوام سے مختلف ہوتے ہیں کہ اسلام اور جدیدیت ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔اس طرح وہ یہ محسوس کرتے ہیں یا عناصر کے تضاد کے حوالے سے ان میں ایک قسم کا احساس جرم ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت جدّت پسند اور مسلمان بھی ہیں۔یہ صورت حال انہیں اپنے طریقے کی وضاحت، پالیسیوں کے دفاع اور زیادہ مستحکم مؤقف اپنانے سے روکتی ہے۔کسی بھی قیمت پر برسراقتدار رہنے پر مصر یہ اپنی تقاریر اور رویوں میں شعبدہ بازی اختیار کرتے ہیں اور یہ ایک ایسا طریقہ ہے جس پر عمل کر کے وہ بنیاد پرستی کا مقابلہ بنیاد پرستی سے کرتے ہیں جس سے مبہم، نا قابل دفاع اور سیاست کی غیر مستحکم شکل سامنے آتی ہے۔''(صفحہ 12)

بہت سے قدیم تصورات کو نئی تعریف کی ضرورت ہے؛ امت واحد ہے۔''اگرچہ پیغمبر اسلام ﷺ کے دور میں لفظ امت کا مطلب ظالموں یعنی بت پرست قریش کے خلاف مظلوموں کی یکجہتی سمجھا جاتا تھا اور اگرچہ تاریخ کے ایک مخصوص دور میں اسے آزادی کی جدوجہد کے احساس سے منسلک کر دیا گیا لیکن آج اس تصور کو سہو زبانی سمجھا جاتا ہے ۔مسلمانوں کا مذہب، جو باضابطہ طور پر ملائیت کو تسلیم کرتا ہے نہ کلیسا کو، ایک ایسا مذہب ہونا چاہئے، جو انفرادی تنہائی کے خاتمے کی حوصلہ افزائی کرے اور رویے، نظریات اور عقائد کے انتخاب میں انفرادی آزادی اور خودمختاری کو مکمل طور پر یقینی بنائے۔اس کے بجائے، اپنی تاریخ کے مطابق، ایک ایسا مذہب رہا ہے جو فرد کو ایک معاشرے میں ضم کر لیتا ہے، اپنی تمام آزادی کھو دیتا ہے اور معاشرے اور ریاست کے جابرانہ قواعد وضوابط کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ علماء کی طرف سے طاقت کے استعمال کو جائز قرار دینے سے جمہوریت اور حقوق انسانی کی ترقی کا نظریہ فروغ نہ پا سکا۔مسلم عوام نے ہمیشہ ایک ''مصنف آمر'' حکمران کا خواب دیکھا ہے یعنی اس قسم کی اتھارٹی جسے سلیم نعمانی کے الفاظ میں ''ہمارے خوابوں کی تشکیل اور امیدوں کی افزائش'' کہا جا سکتا ہے۔

''چونکہ بہت سی قومی ریاستوں نے تنقید کا سامنا کر کے خود کو اپنی تاریخ سے آزاد کرا لیا ہے لیکن ہم نے حقیقت کے ایک حصے کو نظر انداز کر کے اپنی تاریخ مسخ کر لی ہے۔جیسا کہ علی مزغنی نے کہا ہے کہ ''عرب۔اسلامی تہذیب میں ایک خلیج ہے جو تخیل کو حقیقت سے جدا کرتی ہے''۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ کے تعلق کے حوالے سے ہم خود کو ذرا برابر

تنقید برداشت کرنے سے بھی روکتے ہیں۔ اسے ہی وقت میں ہم نے ریاست سے اسلام اور اسلام سے ریاست کو آزاد کردیا'' (صفحہ 126) یہ تمام اسلامی دنیا کے لئے درست ہے۔

1928ء میں الجزائر میں پیدا ہونے والے محمد عرقون نے پیرس میں سربون سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور وہیں اسلامی افکار کے پروفیسر کے طور پر ملازمت کرلی۔ ڈبلیو۔ منٹگمری واٹ کے نزدیک ''وہ ایک صاف ستھرے۔۔ اعتدال پسند مسلمان تھے'' انہوں نے اسلام میں اجتماعیت کے لئے علمی بحث کا آغاز کیا اور مقدس تصانیف کی ایک سے زیادہ تشریحات قبول کرنے پر زور دیا۔ انہوں نے اس راستے کو اجتہاد کا راستہ قرار دیا۔ ''ایک مسلم دانشور کے طور پر میری کوشش میری علمی تربیت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ میرے وجودی تجربے میں پیوست ہے۔ میں نے اردن سے ہائی سکول پاس کیا اور پھر الجیز ریونیورسٹی میں داخل ہوگیا۔ ان دنوں الجزائر پر نوآبادیاتی حکومت تھی۔ دیگر الجزائری باشندوں کی طرح فاتح فرانسیسی ثقافت اور اپنی الجزائری ثقافت کے درمیان تیز اور سخت محاذ آرائی کو دیکھ کر مسلسل صدمے کی کیفیت سے دوچار رہتا۔ (میں بربرزبان اور عربی زبان بولتا ہوں) جب میں نے یونیورسٹی آف الجیرز میں اسلام کے موضوع پر لیکچر سنے تو دوسروں کی طرح مجھے بھی ان کے علمی افلاس پر سخت مایوسی ہوئی بالخصوص اس وقت جب 1950ء اور 1954ء کے الجزائری معاشرے کے سنگین مسائل پر بات ہوئی تو سخت مایوسی ہوتی تھی۔ قومی آزادی کی تحریک نوآبادیاتی حکومت کے اس دعوے کو جھٹلا رہی تھی کہ وہ الجزائر کے عرب مسلم تشخص پر زور دے کر ایک نئی تہذیب پیش کررہی ہے۔ اس ظالمانہ محاذ آرائی کے نتیجے میں، میں نے (1) قوم پرست تحریک کی طرف سے اعلان کردہ عرب مسلم تشخص سمجھنے اور (2) اس حد کے تعین کی کوشش کی جس تک نوآبادیاتی حکومت کی پیش کی گئی جدید تہذیب کو عالمگیر تہذیب سمجھا جاسکتا ہے۔

یہ میرے نفسیاتی تفکرات کی جڑیں ہیں۔ 1961ء سے سربون میں ایک استاد اور دانشور کے طور پر، میں اس اجتہاد سے کبھی دستبردار نہیں ہوا اور اپنے دو ابتدائی سوالوں کے موزوں جواب کی جستجو میں اپنی علمی کاوشیں جاری رکھیں۔ اس سے میرے طریقے اور عزم کی وضاحت ہوتی ہے۔ اسلامی سوچ کے مورخ کے طور پر میرے لئے ایک ثقافتی جگہ ہے جو بحر ہند سے بحر واقیانوس تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ علاقہ زبانوں اور نسلی وثقافتی تنوع کے اعتبار سے انتہائی متمول ہے۔ اس پر دو قطبوں کی سوچ کی روایات کے اثرات ہیں؛ مشرق وسطیٰ کی قدیم ثقافت، جس کا یونانی فلسفے میں خصوصی مقام ہے اور پیغمبروں کی تعلیمات۔ میں نے اس متداول اور متمول علاقے میں اسلام دریافت کرنا سیکھا''
(چارلس کرزماں، معتدل اسلام، ایک حوالے کی کتاب؛ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس 1999ء، صفحہ 206)

عرقون کا کہنا ہے کہ ''مقدس تحریروں میں جمع کیے جانے والے انکشافات میں نکات آغاز، مضبوط جڑیں اور ایک فرد کے ارتقاء کے تصورات جو کہ حقوق سے منسلک ہوں اور ایک ایجنٹ کے طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فرائض کی ادائیگی اور سیاسی برادری میں اپنے دوستوں کا خیال رکھنے کا ذمہ دار ہو'۔ ان کا کہنا ہے کہ ''ماورائیت اور وحدانیت کا طریقہ فرد کے ارتقاء کے لئے والدین اور بھائیوں، قوموں اور قبیلوں، تعریف و اعزازات سے بالاتر ہو کر لامحدود امکانات کا دروازہ کھول دیتا ہے جس سے فرد ایک آزاد و خودمختار انسان بن جاتا ہے جو اس اتحاد کے اندر موجود محبت اور فرمانبرداری کے ذریعے یقینی بنائی گئی آزادی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔'''' اسلام پر نظر ثانی: عام سوالات، غیر معمولی جوابات: ویسٹ ویو پریس 1944ء، صفحات سے 55 اور 57 بحوالہ جان ارماجانی، متحرک اسلام: تبدیلی کے دور میں معتدل مسلم نکتہ نظر: یونیورسٹی آف امریکہ؛ 2004ء صفحہ 135)

اپنی کتاب ''اسلام؛ تعمیر یا تخریب؟ (ویوا ایکس، نئی دہلی 2009ء، 2004ء میں لکھی گئی) میں عرقون نے مسلم دنیا کے ایسے دانشوروں کو درپیش علمی مشکلات کا تجزیہ کیا ہے جن کی اکثریت نے مغربی جمہوری ممالک میں سکونت تو اختیار کی لیکن اپنے آبائی ممالک سے تعلقات استوار رکھے جہاں دقیانوسی تصورات کا راج تھا۔

امریکہ اور ہارورڈ میں آفاقی اسلام کی استاد ڈاکٹر، جائسلین قیصری کے مطابق رمضان یورپی مسلمانوں میں ایک ہر دلعزیز مبلغ ہیں۔ سید رمضان کے فرزند اور اخوان المسلمین کے بانی حسن البناء کا پوتا ہونے کی وہ سے انہیں یورپ کے نوجوان مسلمانوں میں ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔ متعدد کتب کا مصنف ہونے کے ناطے انہیں 1990ء سے یورپ کی اسلامی دنیا بالخصوص طبقات میں ایک خصوصی علمی شخصیت کا اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ سوئٹزر لینڈ کی فری بورگ یونیورسٹی میں اسلامی تعلیمات کے پروفیسر کے عہدے سے ان کی شخصیت مزید اجاگر ہوئی ہے اور روحانیت کی تلاش میں سرگرداں مسلم نوجوانوں کے لئے وہ لائق تقلید شخصیت بن گئے ہیں۔ طارق رمضان فرانسیسی بولنے والے مسلم دنیا میں بھی سب سے زیادہ سنے جانے والے اور سب سے زیادہ محترم دانشور ہیں۔ ان کی شہرت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ فرانسیسی مسلم نوجوان کی امیدوں اور ضروریات کو پورا کرنے کی حکمت عملی سمجھتے ہیں۔

ٹائم میگزین نے ایک مرتبہ طارق رمضان کو دنیا کے 100 عظیم مفکرین کی فہرست میں شامل کیا تھا۔ اگرچہ انہیں یونیورسٹی آف نوٹرے ڈیم میں مذاہب، تنازعات اور امن کی تعمیر کا ہنری آر، لوئیس پروفیسر تعینات کیا گیا تھا لیکن امریکی حکومت نے بغیر کسی وضاحت کے ان کا ویزہ منسوخ کر دیا تھا۔ سہ ماہی نیو پرسپکٹو (سرما 2005ء) کے ساتھ انٹرویو میں انہوں نے اس قسم کی ناانصافیوں کے شکار مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ دفاعی انداز اختیار نہ کریں یا پھر تنہا ہو

جائیں۔انہیں ہرحالت میں بولتے رہنا چاہئے انہیں غلط ہی کیوں نہ سمجھا جائے۔''مغرب کے مسلمان اگر اپنے اپنے معاشروں اور مسلمانوں کے مابین اپنی تفہیم چاہتے ہیں جو کہ ایک پیچیدہ صورت حال ہے تو انہیں بہت واضح اور کھل کر بات کرنا ہوگی۔ سچی بات یہ ہے کہ ایک امریکی مسلمان جب مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسی پر تنقید کرتا ہے تو اس سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے گویا وہ اپنے ملک کے وفادار نہیں ہے۔لوگ کہنا شروع ہوجاتے ہیں کہ ایک امریکی سے زیادہ مسلمان ہو۔میرا نکتہ نظر یہ ہے کہ ایک سچا شہری آزاد معاشرے میں اپنی سوچ کا تعمیری اظہار کرتا ہے اسی طرح مغربی مسلمانوں کو یہ پیغام پھیلانا چاہئے کہ ہم جمہوریت میں رہتے ہیں، قانون کی حکمرانی کا احترام کرتے ہیں، ہم کھلے سیاسی مکالمے کا احترام کرتے ہیں اور ہم سب مسلمانوں کے لئے ایسا ہی ماحول چاہتے ہیں''۔ہم ایک آزاد معاشرے میں رہ کر اسلامی اصولوں سے غداری نہیں کر رہے۔ہم نے سیکولرازم کو گلے لگایا کیونکہ یہ ہم سب کو اکھٹے رہنے کے قابل بناتا ہے۔ یہ ہماری اور ان کی۔۔۔ مذہبی آزادی کی شرط ہے۔۔۔اس لیے آپ سمجھ جاتے ہیں کہ ایک مسلمان اور امریکی یا یورپی ہونا دوطرفہ خصوصیت نہیں ہے، آپ اپنے معاشرے کو زیادہ وقیع بناتے ہیں۔''

طارق رمضان نے دہشت گردی کے ساتھ ساتھ اسلاموفوبیا کی بھی مذمت کی۔ان کا کہنا ہے کہ ''مسلمانوں کو دیگر طریقوں سے اپنی ثقافت کے مطابق روحانی پہلوؤں سے مرکزی اداروں کی معاونت کرنی چاہئے۔'' انہوں نے اپنے سفر کے بارے میں لکھا کہ 'اسلامی سائنسوں کی تاریخ کے مطابق طے کئے گئے علماء کے طریقوں اور قرآن و سنت سے آغاز کیا۔میں نے ان ذرائع کا نئے مغربی تناظر کی روشنی میں مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے لئے بھی میں نے کلاسیکی طریقہ ہی اختیار کیا ہے۔ میں نے بعض اوقات کئی تعریفوں اور اقسام کے بارے میں سوال کرنے اور ان سے مختلف حل پیش کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔اس کام کی تشریح سے میرا مقصد یہ تھا کہ اصلاح کی جانب قدم بڑھایا جائے جو اسلام کے فقہی نظام کے لئے باطنی حیثیت کی حامل تھی اور اس کا مؤثر قیام صرف اس کے اندر سے، اس میں، ان کے مطالعے کے ذرائع اور وسائل سے مخلصانہ وابستگی سے ہی ممکن تھا۔

ایک دانشور کی سوچ، مقصد اور علمیت کے زیادہ حوالے اس لئے دیئے جاتے ہیں کہ کوئی بھی مسلمان جو رستہ بناتا ہے وہ کسی قسم کی غلط فہمی تخلیق نہیں کرسکتا۔ وہ اصولوں پر کوئی سمجھوتہ تسلیم نہیں کرتا۔ کہ 'اسلام ایک ہے' نہ ایمان کے ساتھ۔ ''اللہ تعالیٰ کی مطلق وحدانیت، ان کا نمائندہ ہونے کی ناممکنات اور قرآن مجید میں اللہ کے انکشافات اور احکامات کی سچائی پر ایمان۔

اس عزم کا انسان ہی مسلمانوں سے کہہ سکتا ہے کہ ذرائع کی حقانیت سمجھیں اور ذہانت سے ان کا مطالعہ کریں۔قرآن

مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ ''لیکن قرآن میں آیات اور احادیث نبوی کی بہت بڑی اکثریت دونوں سخت گیر اور مجبور کرنے والی نوعیت کی نہیں ہے۔ قرآن خود میں مستند اور غیر متنازعہ ہے لیکن قانونی فیصلوں کے بارے میں زیادہ تر آیات تجزیے، تبصرے اور تفسیر وتشریح کے لئے کھلی ہیں اور احادیث کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے جس کی اکثریت قیاس کے لئے گنجائش چھوڑتی ہے جیسے ان کے مستند ہونے اور ان کے معانی کے بارے میں قیاس وغیرہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے قوانین وضع کرنے میں فقہا کا لازمی کردار تھا اور آج بھی ہے جنہیں ہم اسلامی قوانین کہہ سکتے ہیں۔

فاضل مصنف وضاحت کرتا ہے کہ ''اصول اور فروع کے درمیان امتیاز کو ذہن میں رکھتے ہوئے تین سطحی مصالح۔ یہ کہ الضروریات، الحاجات اور تحسنیات اور ایسے شعبے جن پر اجتہاد کا اطلاق ہوسکتا ہے، مسلمان علماء اور گروپ رہنماؤں کو چاہئے کہ وہ مغربی مسلمانوں کو موزوں تعلیمات اور ضوابط فراہم کریں جو ان کے لئے عرب، پاکستانی، انڈین یا مغربی مسلمان کے تشخص نہیں بلکہ حقیقی مسلم شناخت کے دفاع کو ممکن بناسکیں''۔

''رمضان شادی، طلاق اور وراثت جیسے موضوعات پر مغربی تناظر میں گفتگو کرتے ہیں۔ وہ تین اصولوں پر زور دیتے ہیں۔'' پہلا یہ کہ اسلامی ذرائع مسلمانوں کو مغرب میں رہنے کی اجازت دیتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ وہ ایک معاہدے کے تحت رہتے ہیں جس کی شرائط کا احترام اس وقت تک لازمی ہے۔ جب تک وہ مسلمانوں کو ان کے ضمیر کے خلاف کام کرنے پر مجبور نہ کریں۔ تیسرا یہ کہ اگر حوالے کی شرائط پر کوئی واضح تنازعہ سامنے آتا ہے۔ جو کہ بہت ہی کم واقع ہوتا ہے۔۔ مسلم فقہا کو اس بات کے تعین کے لئے ایک خصوصی مطالعاتی رپورٹ مرتب کرنی چاہئے تاکہ قانونی رائے وضع کی جاسکے۔ اختیار کرنے کی تمام ممکنہ اقسام واضح ہوں جو مسلمانوں کو اطمینان بخش حل دے سکیں اور جس سے وہ بطور عامل مسلمان اور بطور شہری مطمئن ہوں۔''

29 دسمبر 1930ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس سے اپنے صدارتی خطاب میں علامہ اقبال نے انڈین مسلمانوں پر زور دیا کہ ''اسلام کو اس ''ٹھپے'' سے نجات دلائیں جو عرب بادشاہوں نے اس پر لگا دیا، اس کے قوانین کو متحرک کریں۔ اس کی تعلیم اور ثقافت کو اس کی حقیقی روح اور عصر حاضر کی روح کے قریب لائیں۔

2007ء میں طارق رمضان کی تصنیف سوانح پیغمبر اسلام ﷺ: (پیغمبر: حیات محمد ﷺ کے معانی: ایلن لین) شائع ہوئی۔ یہ ایک سیدھی سادی سوانح ہے جس پر عالمانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ ایک اور تازہ تصنیف ''انقلابی اصلاحات'' ہے جسے ذیلی عنوان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اسلامی اخلاقیات اور حریت کا مطالعہ ہے (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس 2009ء) وہ لکھتے ہیں کہ ''الہامی نصاب انسانی عقل کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالتا بلکہ اس کے برعکس ایک خود مختار متحرک حقیقت پر

عمل درآمد کے لئے متنوع افق اور کئی درواکرتا ہے۔اس سارے نصاب میں عمل کی کئی سطحیں متعین کی گئی ہیں۔جن میں فطری نظام یا انسانی معاشروں کی خصوصیات کا حوالہ دیا گیا ہے بلکہ انسانی ذہانت کو ہمیشہ مشاہدے اور تفہیم کی دعوت دی ہے۔(صفحات 91-92)

رمضان کا کہنا ہے کہ ''تمام اصلاحی مکاتب فکر اس بات پر متفق ہیں کہ مسلم فقہا کو عصر حاضر کے نئے چیلنجوں کی روشنی میں فقہ پر زیادہ اور دوبارہ غور وخوض کی ضرورت ہے۔جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ بلاشبہ عبادت اور عقیدے کے حوالے سے غیر مبدّل تعلیمات تھیں لیکن یہ بھی ضروری تھا کہ ایسی قسم کے قانون اور فقہ کا مشورہ دیا جائے۔جو سماجی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی امور میں معاشروں، طریق کار اور سائنسز کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی کو مدنظر رکھے۔اجتہاد پر، علامہ اقبال کے قول کے مطابق غور کیا گیا، کہ یہ ایسا فطری آلہ ہے جو اسلام کی قانونی روایت نے پیش کیا تا کہ ایسی جدّت اور تجدید حاصل کی جاسکے۔صدیوں کی قانونی وضاحت اس بات کی شہادت ہے کہ بہت سے علماء نے اپنے دور کے چیلنجوں کا جرأت اور عزم کے ساتھ سامنا کیا جبکہ بعض علماء نے تحفظ، خود حفاظتی اور تقلید کو ترجیح دی، شاید وہ اس خدشے میں مخلص تھے کہ اسلام کی تعلیمات کو کرپٹ کیا جاسکتا تھا یا اس لئے کہ وہ اپنے معاصر عوام کو حقیقی اور مخلصانہ جواب فراہم کرنے کے قابل نہیں تھے۔

''یورپی نوآبادیات اور سلطنت عثمانیہ کے بتدریج زوال سے 19 ویں صدی کے آخر میں بعض علماء نے نہادہ پر غور کیا اور اس کے معانی پر نظر ثانی کی کوشش کی خصوصاً فقہ کے شعبے میں اس پر غور کیا۔ایک سو سال سے زیادہ عرصے سے اسلامی قانون اور فقہ کی دنیا ایک مسلسل ہیجانی کیفیت میں ہے جو کثیر تصانیف، بحث ومباحثہ، بڑھتی ہوئی نئی کشیدگیوں اور بعض اوقات مختلف مسالک کے درمیان تنازعات سے پیدا ہونے والی نفی اور باہمی خروج کا نتیجہ ہے۔یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہوگا کہ مغربی مسلمانوں کے تمام طبقات سمیت اسلامی دنیا میں بہت اہم سوالات سامنے آئے ہیں جو حقیقی بحران اور فکر کے حوالے سے اہم سنگ میل کی نشاندہی کرتے ہیں۔یہ بحران، جس پر اس مقالے میں بات ہوگی، کئی پہلوؤں پر مشتمل ہے اور اختیار کے بحران سے موزونیت تک کے بحران پر محیط ہے۔ان کشیدگیوں کو ایک تسلسل کے ساتھ مختلف طریقوں سے مسلم اکثریتی معاشروں اور امریکی، یورپی، آسٹریلوی، ایشیائی اور افریقی طبقوں میں بیان کیا ہے۔مسلم دنیا کا کوئی بھی مبصر یہ دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دلچسپ کثیر پہلوؤں پر مشتمل نئی اور تیز بحث ومباحثہ کے ساتھ بحرانی کیفیت میں ایک تسلسل ہے۔''(صفحات 28-29)

علی شریعتی (1933-1977ء) ایک ممتاز مذہبی مدرس کے فرزند تھے۔انہوں نے سربون سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری

لی اور ایرانی تحریک کے متحرک کارکن بن گئے۔ یونیورسٹی آف مشہد میں ان کے لیکچر کے سامعین کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی۔شاہ کے دور میں پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا لیکن عالمی سطح پر چلنے والی مہم کے دباؤ پر انہیں رہا کر دیا گیا۔علی شریعتی کی موت لندن میں پُر اسرار حالات میں واقع ہوئی تھی۔ان کے لیکچر اور تحریریں آزادی کے نظریے پر مضامین ہوتے تھے اور جدوجہد میں شہادت تسلیم کرنے پر آمادگی سے متعلق تھے۔

عبدالکریم سروش نے ایران اور برطانیہ میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہ مختلف سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ان کا کہنا ہے کہ مذہب الہامی ہے لیکن مذہبی تشریحات انسانی ہیں اور ان میں غلطی ہوسکتی ہے۔اس مؤقف پر 1990ء کے عشرے کے وسط میں انہیں قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ مذہبی علم کے عروج و زوال کے موضوع پر اپنے ایک مضمون میں سروش نے اس جانب اشارہ کیا کہ ''مافوق الفطرت کے بارے میں سیکولر نکتہ نظر اندھا ہے لیکن ہم یہاں انسانی تشریح کو ایسے دیکھتے ہیں جیسے کوئی نیا نزول ہوا ہو جیسے اس تشریح کو عقل وخرد کے اس دور میں کسی فرشتے کے ذریعے آسمان سے زمین پر بھیجا گیا ہو جبکہ ایک مرتبہ ماضی میں اس کا نزول پیغمبر اسلام ﷺ پر ہو چکا تھا''۔ بالفاظ دیگر ہم الہامی کلام کو تشریحات کے آئینے میں دیکھتے ہیں جیسے ایک مخلص سائنسدان تخلیق کو فطرت کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ پیشرفت کے بارے میں ہمیں یقین نہیں لیکن ارتقاء کی یقیناً ضمانت دی گئی ہے۔

''اب علم اور اعتقاد کے درمیان فرق بہت زیادہ ہو گیا ہے۔اعتقاد ہمیشہ ذاتی اور نجی اور پختہ لیکن علم اجتماعی،عوامی اور قابل خطا ہوتا ہے۔علم کے ارتقاء کے تاریخی عمل پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ الہامی کلام کی ان کی اپنی تشریح پر انفرادی مسلمانوں نے پختہ ایمان کے باوجود عم کا کاروان، ہر قسم کے پیچیدگیوں اور تضادات سے آگاہ۔آگے بڑھ رہا ہے، تضادات مقابلوں اور اس کے ارکان کے باہمی تعاون سے۔۔۔انفرادی خواہشوں اور ادیان سے قطع نظر۔۔۔ پیشرفت کر رہا ہے۔'' (گرزمان،صفحہ 251)

محمد خاتمی کے بطور ایرانی صدر انتخاب سے علمی پوزیشن مستحکم ہوئی۔صدر نے کھلے عام تہذیبوں اور ثقافتوں کے مابین مکالمے کی وکالت کی۔سروش ایرانی بائیں بازو اور مارکسیوں، دونوں کے ناقد تھے۔والہ وکیلی کے مطابق 'سروش کا کہنا ہے کہ ایک مذہبی معاشرہ مذہب کو زیادہ تر اس لئے گلے لگاتا ہے کیونکہ یہ معاشرے کے عمومی احساس انصاف کے مطابق ہوتا ہے۔آج اس احساس میں انسانی حقوق کا احترام بھی شامل ہے۔اگر ایک حکومت انسانی حقوق کا دفاع کرتی ہے تو وہ مذہب کا بھی دفاع کرتی ہے کیونکہ مذہب کی منصفانہ تفہیم کے ساتھ حقوق انسانی بھی جڑے ہوئے ہیں؛''حقوق انسانی کا احترام ۔۔۔نہ صرف جمہوری حکومت کی ضمانت دیتا ہے بلکہ یہ مذہبی نوعیت کا بھی

ہے۔''
عوام کی رضامندی کی بنیاد پر قائم حکومت اسلامی نظریئے سے اپنا جواز اخذ نہیں کرتی بلکہ اس وقت تک یہ حکومت برسراقتدار رہتی ہے جب تک عوام چاہتے ہیں۔''ایک مذہبی جمہوری حکومت اس وقت جواز سے محروم ہو جاتی ہے جب یہ نہ صرف عوامی خواہشات کے برعکس کام کرتی ہے بلکہ یہ عوامی احساس مذہب کی بھی خلاف ورزی کرتی ہے۔ ایک مذہبی معاشرے میں مذہب کی عام تفہیم رائے عامہ کو تسلیم کرنے کی حدود فراہم کرتی ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ اس تفہیم میں اضافے کی اجازت دی جانی چاہئے تاکہ وہ معاشرے کی بدلتی ہوئی ضروریات اور عقائد کا عکس پیش کیا جا سکے۔ایک نظریاتی حکومت کے برعکس، جمہوری حکومت کی جڑیں اس عوامی تفہیم میں ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے مذہبی وعلم تفہیم کی افزائش میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔فقہ تک محدود رہنے والی حکومت کے برخلاف ایک جمہوری حکومت مذہبی قوانین پر سختی سے عمل درآمد کی پیروی نہیں کرتی بلکہ مذہبی قوانین ،جس طرح یہ مذہبی نصاب میں آتے ہیں کی تشریح اور وضاحت کے لئے علمی شاخوں کے مذہبی اور غیر مذہبی ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں۔یہ قوانین معاشرے کے ساتھ عمومی طور پر منطبق ہونے چاہئیں۔چاہے مذہب کی تفہیم میں تبدیلی ہی کیوں نہ آ جائے (السپوستوااوروال؛ صفحہ 161)

اسلام میں عقل،آزادی اور جمہوریت،عبدالکریم سروش کی تحریروں کا زبردست مجموعہ ہے جس کا مرتبہ اور تدوین محمود صدری اور احمد صدری کی منظوری سے کی گئی (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس 2000ء) اس میں بھی انہوں نے علامہ اقبال کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے جو کئی صفحوں پر محیط ہے۔

اس کتاب کے دو پیراگراف ان کی فکر کا جوہر پیش کرتے ہیں۔''یہ خدا پر منحصر ہے کہ وہ مذہب نازل کرے لیکن یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اسے سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔یہی وہ مرحلہ ہے جب مذہبی علم کی تخلیق ہوئی جو مکمل انسانی اور انسانی علم کے تمام مراحل سے متعلق ہے۔مذہب ومبدّل کی جستجو کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان دونوں کے درمیان امتیاز اور ان کے ملحقات کا تعلق ''مذہبی علم'' سے ہے اور وہ مذہب کی ایک مخصوص تشریح کی پیروی کرتے ہیں۔مستقل اور مبدّل کا تعین مذہب کی تفہیم سے پہلے نہیں بلکہ بعد میں حاصل کیا جاتا ہے۔اس طرح ہر جگہ ہمیں مذہبی علم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو مذہب سے متعلق اور اس کا مشاہدہ ہوتا ہے لیکن یہ بجائے خود مذہب نہیں ہوتا''۔(صفحات 2-31)

انہوں نے مزید کہا کہ''جو لوگ آزادی کو سچ کو دشمن اور غلط نظریات کی ممکنہ پرورش گاہ کہہ کر مسترد کرتے ہیں وہ اس امر

کا احساس نہیں کرتے کہ آزادی بجائے خود سچ ہے۔ایسے لگتا ہے جیسے یہ لوگ آزادی کو ایک رحمت، سچ اور نیکی نہیں سمجھتے۔ یہ ایسے کام کرتے ہیں جیسے ہوا بہت گرم ہو، یہ فریب نظر اور مفروضہ ہو اور یہ تسلیم کرنے میں ناکام رہیں کہ آزادی کا حصول اور احساس سچ کو مستحکم اور باطل کو کمزور کرتا ہے۔ دنیا نظریات کے تبادلے کی منڈی ہے۔ ہم لیتے اور دیتے ہیں اور ہم بڑی سچائیوں پر اعتماد کرتے ہیں اور کبھی کبھار کے چھوٹے سچ ان پر قربان کرتے ہیں۔شراب کا تسلسل برقرار رہے گا چاہے وقتی ساغر ٹوٹ ہی کیوں نہ جائے۔(صفحہ 91)

انقلاب کی معقول سوچ کا یہ تذکرہ ایک ایسی کتاب میں کیا گیا جس کا بہت کم نوٹس لیا گیا ''تمام موسموں کا مذہب، اسلام اور جدید دنیا کے چیلنج'' (ایوان آر۔ڈی شکاگو؛ 1990ء) اس کے مصنف شبیر اختر پاکستان میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے کیمبرج سے فلسفے میں گریجویشن اور تقابلی مذہب میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد بریڈفورڈ میں سکونت اختیار کر لی۔''عوام کے ایک گروپ کے طور پر جدید مسلمان افسوسناک حد تک غیر منعکس ہیں۔۔۔ایسے لگتا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لئے سوچ کا سارا کام خود ہی کر دیا تھا۔۔۔ایک عظیم قومی فلسفیانہ روایت کے ارتقاء کے بعد اسلام کے پیروکار ایک علمی سست روی کا شکار ہو گئے جو پہلے ہی تقریباً نصف ملینیئم پر محیط ہو چکی ہے۔۔۔۔معتدل اور خصوصی اثرات کی عدم موجودگی، جس کا سلسلہ فلسفیانہ روایات کے فقدان تک جا پہنچا ہے، چند مسلمان ہوں گے جنہوں نے سیکولریت اور نظریاتی اجتماعیت کا ادراک کیا ہے، جو ہمیں موجودہ حالات کی گاڑی میں سوار کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے ان کا مشورہ ترک اسلام نہیں ہے بلکہ اپنی ذات کا عرفان اور خود شناسی کا حصول ہے کہ اسلام بلاشبہ ''تمام موسموں کے لئے مذہب'' ہے۔ وہ سخت سوالات کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ ''کیا یہ فرض کرنا مسلمانوں کے لئے بلاشبہ دانشمندانہ ہو گا کہ اسلام، ماورادینیت کے سچ کے بارے میں حالیہ تحفظات سے مکمل قطع نظر، قابل عمل ہے۔کیا یہ مسلمانوں کے لئے ان شکوک اور ہچکچاہٹ کے ساتھ تخلیق تعلق بہتر نہیں ہوگا؟ مسلمانوں نے پہلے ہی مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی کے جہاز کی صورت میں جدیدیت کا سامنا کر رکھا ہے اور اگر ایسا محض تسلسل کی وجہ سے ہے تو پھر مذہبی وابستگی کی سطح پر ہو سکتا ہے؟

اسلامی احکامات میں روایتی اعتماد اب مکمل طور پر موجود نہیں ہے۔افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ روایتی اسلام زوال پذیر ہے، تعلیم یافتہ طبقے کے بہت سے افراد نے اس سے دوری اختیار کر رکھی ہے۔ جدید ذہن کو متاثر کرنے والے مسائل کے حل سے انکار کرنے، جدیدیت سے گھل مل جانے اور اس کی قبولیت میں مکمل نااہلیت کے مظاہرے سے، بتدریج اسلام کی گرفت اسی طرح کمزور ہو رہی ہے جس طرح چند سال پہلے عیسائی چرچ کی گرفت سیکولر پیروکاروں کی روزمرہ

زندگی پر ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ واقعاتی طور پر اسے حتمی سمجھ لینا غیر دانشمندانہ ہوگا کہ اثر ورسوخ میں یہ کمی محض حقیقی اسلام کا ایک مرتبہ پھر نیا سورج طلوع ہونے سے پہلے کی لازمی تاریکی ہے۔ کیونکہ افراد اپنے سیکولر اطوار میں خطائیں دیکھنے کے بعد ہی دل وجان سے مذہب کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ اس طرح سے سوچنا بدقسمتی سے خود کو معذرت خواہانہ تصورات کے فریب کے حوالے کے مترادف ہے۔۔۔''

''میرے خیال میں یہ سوچنا اسلام سے غلط وفاداری ہے کہ موجودہ دور کی سیکولر رائے کی لہر سے اسے الگ کرنے سے اس کے مفادات کا تحفظ ہوگا۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اب بھی کہوں گا کیونکہ اس کا بار بار دہرایا جانا بہت اہم ہے۔ جلد یا بدیر اسلام کو دیگر مذاہب کی طرح سیکولر عقل کا سامنا کرنا پڑے گا اور اسے جدیدیت کے ٹرائیل کو صبر سے برداشت کرنا ہوگا۔ اس حد تک کہ مسلم سوچ عقیدے کے قلعے میں بند رہے۔ اپنی صوبائیت میں محفوظ رہے، تو پھر ناقد اپنے اس شک میں درست ہوگا کہ مسلمانوں کو اندر سے یہ خوف ہے کہ اسلام حقیقت پسندی کے عام حالات میں محفوظ رہنے کا اہل نہیں ہے۔ اور یہ سیکولر جدیدیت کے ٹرائل میں زندہ رہنے کے قابل نہیں۔ کیا اسلام اور اس کے احکامات منظّم تفتیش کو صبر وتحمل سے برداشت کرنے کے اہل ہیں؟ ہم مسلمانوں کے لئے یہ بہترین وقت ہے کہ ہم عقائد کے حصار سے بالاتر ہو کر سوچیں اور اپنے سر اوپر اٹھائیں۔ (صفحات 16-17)

اگر ہم یہاں توقف کر کے سوچیں تو آراء مختلف ہو سکتی ہیں لیکن یہ تمام مفکرین پکے مسلمان ہیں جو دین کی تفہیم میں عقل کے استعمال سے مخلص بھی ہیں۔ تاہم یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو سکروٹنی کے معمول کے طریقوں یا معیار پر جانچنا، اللہ کے ارشادات کے تقدم وتاخر (جو بھی بہتر ہو) سے انکار نہیں ہے۔ یہ محض تبصرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقیقی ارشادات کا تعین کیسے کیا جائے اور اس کے لئے سفارش یہ کی جاتی ہے کہ ہمیں صرف وہ ذریعہ استعمال کرنا چاہئے جو ہمارے پاس موجود ہے اور وہ ہے عقل کے طریقے'' (صفحہ 27)

ایک اہم پیراگراف میں شبیر اختر کہتے ہیں کہ ''حقیقی مذہب کی جڑ دنیا سے نفرت میں ہے نہ آخرت سے محبت میں؛ یہ دراصل انسان کے داخلی فرائض پورا کرنے میں انسانی فطرت کی نا اہلی سے آگاہی میں ہے اور وہ مقاصد جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ صرف مذہبی اقدار وابستگی کے عہد پر موزوں عمل درآمد سے ہی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مرکزیت کے دین، اسلام میں سختی اور تواتر سے ایسی غلط قیاس آرائیوں کی مذمت کی گئی ہے جو انسانی قوت کے خالص رجائیت پسندانہ مگر ناجائز تخمینے سے متعلق ہوتی ہیں (کیو 75;36-40,75:1-6,96:6-7, 90:57) اس لئے یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہوگی کہ حقیقی مذہبی فکر کے لئے یہ ناممکن ہوگا کہ وہ سیکولر وجود کو کم تر کر

سکے۔''(صفحہ 141)

یہ ہمیں ان کے جرأت علم وفضل اور انکسار کے اعلیٰ تناسب سے متعارف کراتا ہے۔ یہ فضل الرحمٰن ہیں۔ ''فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی ڈائریاں۔1966ء۔1972ء''، (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی 2007ء) میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ وہ انہیں علماء کے غیض وغضب سے بچانے میں ناکام رہے۔''ڈاکٹر فضل الرحمٰن۔ جو اسلامی تحقیقاتی ادارے کے ڈائریکٹر تھے۔جنہیں ان پڑھ اور سیاست زدہ ملاؤں کی پھیلائی ہوئی منفی تنقید کا ملک بھر میں سامنا کرنا پڑا۔ان پر لگائے جانے والے الزامات قطعاً غلط تھے جو ان کی کتاب ''اسلام''میں کئے گئے کسی تبصرے سے متعلق تھے۔ یہ کتاب انہوں نے چند سال قبل لکھی تھی جسے بعد ازاں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا۔

یہ ایک عالمانہ تصنیف ہے جو یورپی قارئین کے لئے لکھی گئی ہے اور اس کا مقصد اسلام کے بارے میں پھیلائی گئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا ہے۔ جب ملک بھر میں ان پر تنقید زور پکڑ گئی تو انہوں نے دو پریس کانفرنسیں منعقد کیں جن میں خود پر لگنے والے تمام الزامات کو مسترد کیا۔ دیانتدار ناقدین کو ان وضاحتوں سے مطمئن ہو جانا چاہئے تھا۔لیکن ملّاں ۔۔جو اسلام کی حقیقی اور معروضی فکر کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔مطمئن ہونے والے نہیں تھے۔اس قسم کے دلائل تو ملاؤں کی فیکٹری کے لئے چارہ ہوتے ہیں۔

''دریں اثناء مرکز اور صوبوں میں بھی منتظمین نے سرد مہری دکھائی۔بعض نے تو ڈاکٹر کو مستعفی ہونے کا مشورہ دے دیا۔وہ کچھ خوفزدہ بھی ہوئے تھے۔کیونکہ جہالت اور تعصب کی بنیاد پر کی جانے والی تنقید کا سامنا آسان نہیں ہوتا۔لہٰذا مجھے اس یقین کے ساتھ ہچکچاتے قبول کرنا پڑا کہ وہ حکومتی پابندیوں سے نکل کر جہالت اور ملایت کے قلعے پر باہر سے حملہ کرنے میں زیادہ آزاد ہوں گے۔ یہ بھی بڑا واضح ہے کہ اسلام پر کسی بھی ایسی تحقیق کو جو نئی تشریحات اور نئے پہلو سامنے لانے کا موجب بنے،اسے ان پڑھ اور ملائیت کے زیر اثر معاشرے میں قبول نہیں کیا جاتا۔ یہ لوگ اسلام کو ترقی کا ذریعہ بننے کی اجازت نہیں دیں گے۔لہٰذا اس حوالے سے پیشگوئی کرنا مشکل نہیں کہ عقل وسائنس کے اس دور میں ایسے اسلام کا مستقبل کیا ہوگا۔ڈاکٹر فضل الرحمٰن شکاگو یونیورسٹی چلے گئے اور اپنے علم وفضل کی وجہ سے وہاں انہوں نے عالمی شہرت حاصل کی۔''ایک طرح سے انہوں نے ہمیں قرآن پڑھنا سیکھا۔

فضل الرحمٰن گذشتہ صدی کے دوران قرآن کے سب سے محترم ومعروف محقق تھے۔دیوبند مدرسے سے فارغ التحصیل باپ کے فرزند کے تبصرے اور تشریحات ہمیشہ قرآنی حدود وقیود کے اندر رہے(ان کی کتاب اسلام اور جدیدیت کی تفتیش پر ایس منظور پرویز کا تبصرہ، دسمبر 1984ء)وہ 1968ء میں یونیورسٹی آف شکاگو میں اسلامی تعلیمات کے

پر روفیسر تعینات ہوئے اور 1988ء میں اپنی وفات تک وہیں تعینات رہے۔ان کا ''دوہرے تحرک'' کا نظریہ بہت شاندار ہے۔اگر ہم قرآن کا بنظر غائر مطالعہ کریں تو اس سے ہمیں بہت سے عمومی اصلول نہیں ملتے؛اکثر حصے میں یہ حل دیتا ہے اور ٹھوس تاریخی اور خصوصی مسائل پر فیصلے سناتا ہے۔لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ ظاہر یا داخلی طور پر اس حل اور فیصلوں کے پس پردہ ایسے جواز اور حقائق ہوتے ہیں جن سے عمومی اصول اخذ کئے جا سکتے ہیں ۔قابل عمل اسلامی قوانین اور اداروں کی حقیقی تعمیر کے لئے دو مرحلوں پر مشتمل تحریک ہونی چاہئے۔پہلا یہ کہ قرآن کے معاملات میں ٹھوس اور مستقل رویے سے ہٹ کر رہنا چاہئے۔اپنے عہد کے متعلقہ اور ضروری سماجی حالات کو بھی زیر غور لانا چاہئے اور عمومی اصولوں سے وابستہ رہنا چاہئے جن پر تمام تعلیمات کا انحصار ہے۔دوسرا یہ کہ اس عمومی سطح سے خصوصی قانون کی جانب رجوع ہونا چاہئے اور اس دور کے لازمی اور متعلقہ سماجی حالات کو بھی مد نظر رکھا جانا چاہئے۔''(اسلام اور جدیدیت:صفحہ 20)

انہوں نے شکایت کی کہ قرآنی آیات کی ترتیب نزول کے اعتبار سے مطالعہ کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔اس سے تناظر کا پتہ چلے گا۔اگر قرآن کو تناظر میں پڑھنا ضروری ہے تو حدیث میں بھی گہری تحقیق ہونی چاہئے۔اور علماء کو اس پر موزوں توجہ دینی چاہئے۔ابوالاعلیٰ مودودی کو ''عالم و فاضل'' کہا جاتا ہے جبکہ فضل الرحمٰن کا کہنا ہے کہ ''وہ کسی بھی حوالے سے مستند اور ایک مکمل دانشور نہیں ہیں۔''

فضل الرحمٰن کے مطابق ''حتیٰ کہ قرآن مجید کا قانونی حصہ بجائے خود اپنا واقعاتی کردار واضح طور پر نمایاں کرتا ہے۔مثال کے طور پر مسلمانوں اور ان کی مخالفین کے درمیان امن و جنگ کے قرآنی تلفظات مکمل واقعاتی ہیں۔اعلانات جو کسی معمولی جدوجہد میں دشمن یا کمیونٹی کے مثالی رویے کے بارے میں بعض عمومی کردار پر محیط ہوتے ہیں لیکن یہ ایسے واقعاتی ہوتے ہیں کہ انہیں صرف جزوی قانونی سمجھا جا سکتا ہے۔اور یہ سخت اور خصوصی طور پر قانونی نہیں ہوتے۔''(تاریخ میں اسلامی طریقہ،کراچی،1965ء،صفحہ 10)

انگریزی بولنے والے افراد کے مابین قرآن فہمی میں دلچسپی کی تجدید ہوئی ہے۔اس لئے انگریزی ترجمے کئے اور شائع کئے جا رہے ہیں۔اور ان میں ہر ایک کا انداز منفرد ہے۔اس سے سیکھنے اور جاننے کا جذبہ بڑھتا ہے۔ایم اے ایس عبدالحلیم مصر میں پیدا ہوئے وہ الازہر اور کیمبرج یونیورسٹی کی علمی پیداوار ہیں۔وہ جریدہ مطالعہ قرآن کے مدیر ہیں۔ان کا ترجمہ جس کے ساتھ عربی متن بھی ہے۔ 2004ء میں شائع ہوا۔ 2010ء میں اس کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن شائع ہوا۔اس کا تعارف اور حاشیے پروفیسر عبدالحلیم نے تحریر کئے (دی قرآن: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس) تعارف میں انہوں

نے ایسی آیات کو الگ کر دیا ہے جن کے بارے میں مغرب اور بنیاد پرست دونوں غلط تشریحات پیش کرتے ہیں۔
طارق خالدی 1938ء میں یروشلم میں پیدا ہوئے اور تعلیم شکاگو اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں حاصل کی۔ ''دی قرآن: ایک نیا ترجمہ'' پنگوئین کلاسیکی سریز میں 2008ء میں شائع ہوا۔ ذیلی عنوان ان کے مقصد کی وضاحت کرتا ہے۔ جیسا کہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ لیلیٰ بختیار کا ترجمہ، جسے خود انہوں نے 2009ء میں شائع کیا، نے ایک تنازعہ چھیڑ دیا۔(دی سبلائم قرآن: ترجمہ لیلیٰ بختیار، تقسی کار قاضی پبلی کیشنز، 3023 ویسٹ بلمانٹا ایونٹ، شکاگو lll، 60618)
وہ اس پر یقین نہیں کر سکیں کہ آیت 4:34 میں بیوی کو زدوکوب کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ برسوں کی کاوشیں انہیں ایڈورڈ ولیم لین کی عربی۔انگریزی لغت تک لائیں جو 19ویں صدی میں شائع ہونے والی 3064 الفاظ پر مشتمل قاموس ہے۔لفظ ''ضربہ'' کے چھ معانی درج ہیں۔ان میں سے ایک ہے''دور پرے چلے جانا'' انہوں نے دعویٰ کیا ''میں نے خود سے کہا اوہ خدایا! پیغمبرﷺ کا یہی مطلب تھا'' ان کے ترجمے میں ایک عمومی انڈیکس ہے۔ وہ اس بات سے انکار کرتی ہیں کہ ان کا ترجمہ ''نسوانیت والا ترجمہ'' ہے یہ ایک ایسے فرد کا ترجمہ ہے'' جو روحانی سالمیت'' پر عمل کرتا ہے جس کا تعلق صوفی ازم سے ہے۔ان کا تعارف قرآنی آشکار کرنے کی فکر انگیز کوشش ہے۔
ضیاالدین سردار کی کتاب ''مطالعہ پاکستان: اسلام کے مقدس نصاب کی معاصر ضرورت'' (ہرسٹ اینڈ کمپنی لندن: 2011ء) جیسا کہ توقع کی جا سکتی تھی، ایک انتہائی علمی اور تحقیقی تصنیف ہے۔جس کی فکر حیرت انگیز حد تک حقیقی اور غیر معمولی طور پر تعمیری ہے۔ پاکستان کے صوبہ پنجاب میں پیدا ہونے والے ضیاالدین کا خاندان اس وقت لندن منتقل ہو گیا جب ان کی عمر 9 برس تھی۔روایت کے مطابق انہوں نے قرآن مجید کی ابتدائی تعلیمات آغوش مادر میں حاصل کیں جس کی وجہ سے انہیں اس کلام سے گہری محبت ہوگئی اور قرآنی تعلیمات کے فروغ میں ان کا غیر معمولی حصہ اسی تربیت کے فیض کا نتیجہ ہے۔انہوں نے بڑے متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ان موضوعات میں جنگ اور امن، حج، کفر، نقل مکانی، شادی اور طلاق، عبادات، روایت اور اخلاقیات، پردہ، آزادی کا اظہار، فن، موسیقی اور تخیلات، شریعت، اقتدار اور سیاست، عقل و علم، ''اللہ کی حاکمیت اور مذہب کی آزادی'' اور ''خدا کے ساتھ مکالمہ'' شامل ہیں۔ وہ ایک مخلص، عالم اور مفکر مسلمان ہوتا ہے جو ایک کتاب میں ایسے دو موضوعات پر رہنمائی فراہم کرتا ہے، جو کتاب باعث فخر اور لائق مطالعہ ہوتی ہے۔
مسلم خواتین کے ایک نمایاں گروپ نے بھی بڑی محنت سے اسلام اور خواتین کے بارے میں فکر انگیز کام کیا ہے

یونیورسٹی آف رباط، مراکش میں عمرانیات کی پروفیسر فاطمہ مرنیسی کی تحریروں نے ایک ارتعاش پیدا کیا۔ ان کی کتاب ''خواتین اور اسلام: ایک تاریخی اور دینی تحقیق'' (بلید ول پبلشرز 1991ء اور کالی برائے خواتین نئی دہلی 2993ء) یہ روایتی بالخصوص حدیث کے حوالے سے ایک جامع چیلنج پیش کرتی ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت 8 جون 632ء کو ہوئی۔ سب سے بڑے اور محترم محدث امام بخاری جولائی 810ء میں پیدا ہوئے اور اگست 870ء میں فوت ہوئے۔ صدیوں سے ان کے احادیث کے مجموعے صحیح بخاری کو سب سے زیادہ مستند مجموعہ سمجھا جاتا ہے'' یہ حدیث ان افراد کے لئے برہان قاطع کی حیثیت رکھتی ہے جو خواتین کو سیاست سے باہر رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ حدیث دوسرے مستند محدثین کے مجموعوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ جن میں مسند کے مصنف احمد بن حنبل بھی شامل ہیں۔ جو حنبلی مسلک کے بانی ہیں یہ مسلک دنیا بھر کے سُنی مسلمانوں کے چار فقہی مسالک میں سے ایک ہے۔ یہ حدیث اتنی اہم ہے کہ اس کا حوالہ دیئے بغیر خواتین کے سیاسی حقوق پر بحث عملاً ناممکن ہو جاتی ہے۔ اس پر بحث کئے اور پوزیشن لئے بغیر اس موضوع پر بحث ہو ہی نہیں سکتی۔۔۔ یہ لازمی اور مفصل ہے'' (صفحہ 14)

مرنیسی کے مطابق ''امام بخاری نے 4000 کے قریب دو مرتبہ بیان کی گئی احادیث کو نکال کر صرف 7275 مستند ترین احادیث رکھی ہیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یاداشت کی کمزوری پر قابو پانے کے امام بخاری کے تجربے سے ہمیں سب سے اہم سبق یہ ملتا ہے کہ اپنے طریقے کے ساتھ انسان کو مخلص ہونا چاہئے۔ اور اس کا احترام کرنا چاہئے۔ ان تمام پر بداعتمادی جو ایسے معاملات سے منسلک ہیں صرف حدیث کی مدد سے ہی ہونی چاہئے۔ امام بخاری کے دور میں۔۔۔ جو وفات پیغمبر ﷺ کے بعد سے دو صدیوں سے بھی کم ہے۔۔۔ بھی 596,725 غلط احادیث گردش میں تھیں۔ (600,000 منفی 7275 جمع 4000)، یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ آج ایسی کتنی احادیث ہوں گی''۔ وہ انتہائی پاکباز انسان تھے جنہوں نے برسر اقتدار سلطان کو بھی کھری کھری سنائی تھیں۔ مرنیسی ان کی بہت بڑی مداح ہیں لیکن انہوں نے ان کی تحقیق کا جائزہ بے حد احتیاط سے لیا ہے۔ ''امام بخاری کے مطابق ''یہ فرض کیا جاتا ہے کہ وہ حضرت ابوبکرہؓ ہوں گے جنہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا: وہ جو اپنے معاملات خواتین کے سپرد کر دیتے ہیں، کبھی خوشحالی نہیں دیکھیں گے'' چونکہ یہ حدیث صحیح بخاری میں شامل ہے جو کہ ہزاروں مستند احادیث کا مجموعہ ہے، لہٰذا اسے درست سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اسے درست ثبوت کے بغیر اس مجموعے میں شامل نہیں ہونا چاہئے تھا۔ چونکہ ہم ایک سائنٹیفک دنیا میں رہ رہے ہیں لہٰذا بحیثیت ایک خاتون کے مجھ پر کوئی ایسی پابندی نہیں کہ میں اس حدیث کو تاریخ اور روایت کے دوسرے طریقوں سے نہ جانچوں۔ خاص طور پر ان حالات کا

جائزہ نہ لوں جن میں سب سے پہلے اس حدیث کو استعمال کیا گیا۔ اس حدیث کا راوی کون ہے، اسے کہاں، کب، کیوں اور کس کے سامنے بیان کیا گی؟

''حضرت ابو بکرہؓ صحابی رسول تھے جو حیات رسول ﷺ سے بخوبی واقف تھے اور انہوں نے آنحضرت ﷺ کی صحبت میں اتنا وقت گذارا تھا کہ وہ حدیث بیان کر سکتے تھے اور یہاں ان کے بولنے یا حدیث بیان کرنے کو فرض کیا جا رہا ہے۔ ان کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ نے یہ حدیث اس وقت بیان فرمائی جب انہیں معلوم ہوا کہ اہل فارس نے ایک خاتون کو اپنا حکمران نامزد کر دیا ہے۔ ''جب کسریٰ مر گیا اور اس کی موت کی خبر سن کر آپ ﷺ نے استفسار کیا کہ ''اور اب اس کا جانشین کسے بنایا گیا ہے؟'' جواب دیا گیا کہ 'انہوں نے اقتدار اس کی بیٹی کے سپرد کر دیا ہے۔ ''حضرت ابو بکرہؓ کے مطابق یہی وہ لمحہ تھا جب پیغمبر اسلام ﷺ نے مبینہ طور پر خواتین کے بارے میں ایسا کہا ہو گا۔۔۔

''حضرت ابو بکرہؓ نے کس موقع پر حضور اکرم ﷺ کے یہ الفاظ دہرائے اور انہوں نے ایسا کہنے کی ضرورت کیوں محصوص کی؟ حضرت ابو بکرہؓ کا حافظہ یقیناً بے حد توانا ہونا چاہئے کیونکہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی رحلت کے ربع صدی بعد یہ الفاظ دہرائے تھے،اس وقت جب حضرت علی کرم اللہ وجہ نے جنگ جمل حضرت عائشہؓ کو شکست دے کر بصرہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔۔۔

''اگر چہ متعدد صحابہ اور بصرہ کے مکینوں نے اس تنازعہ میں غیر جانبدار رہنا پسند کیا تھا، صرف حضرت ابو بکرہؓ نے اس حقیقت کا جواز یہ دیا کہ فریقین میں سے ایک فریق خاتون تھی۔۔۔

''حضرت ابو بکرؓ نے ایک اور ایسی حدیث مروی ہے کہ جو کہ نازک لمحات سے متعلق ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کی شہادت کے بعد خاندان امیہ سے معاویہؓ اسی صورت میں اپنی خلافت کا جواز حاصل کر سکتے تھے اگر حضرت علیؑ کے فرزند اور جانشین حضرت امام حسنؑ تحریری طور پر اپنے حق سے دستبردار ہو جاتے۔ انہوں نے ایسا انتہائی دباؤ اور ایک سمجھوتے کے تحت کیا جس پر بہت کم روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس موقع پر حضرت ابو بکرہؓ کو ایک حدیث یاد آئی جو سیاسی حالات و واقعات اور ان دیکھے نتائج کے تحت اس سے بہتر نہیں ہو سکتی تھی۔ انہوں نے فرض کیا کہ انہوں نے رسالت مآب ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''فرزند علیؑ، امام حسنؑ مفاہمت کرنے والے ہوں گے۔ امام حسنؑ اس وقت نہایت کم سن ہوں گے جب ان کے نانا پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی بیٹی فاطمہ سلام اللہ علیہا کی وساطت سے یہ کہا ہوگا۔ سیاسی مواقع کے بارے میں احادیث کے حوالے سے ابو بکرہؓ کی یاداشت واقعی بڑی تیز تھی جو حیرت انگیز اور مؤثر

طور پر تاریخ کے دھارے میں بیٹھ گئی۔

ابوبکرؓ پر جھوٹی گواہی دینے کا جرم ثابت ہو گیا تھا اور خلیفہ عمرؓ ابن الخطاب نے اسے کوڑے مارنے کی سزا دی تھی'' اس تحقیق کے اختتام پر آیئے اس غلط حدیث کے بارے میں پہلی صدیوں کے فقہا کا رویہ دیکھیں جو کہ آج ہمیں انتہائی مقدس، ناقابل تردید اور سچی حدیث کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ اگر چہ اسے امام بخاری اور دیگر محدثین نے صحیح احادیث میں شامل کیا ہے لیکن اکثر نے اس پر بڑی تفصیل سے بحث کرتے ہوئے تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ فقہا خواتین اور سیاست کے بارے میں احادیث کو زیادہ وزن دینے پر متفق نہیں۔ یقیناً بعض نے اسے خواتین کو فیصلہ سازی سے خارج کرنے کے حوالے سے دلیل کے طور پر استعمال کیا جبکہ ایسے بہت سے فقہا بھی ہیں جن کے نزدیک یہ غلط اور بے بنیاد ہے۔ الطبری وہ مستند ثقہ مذہبی مفکر ہیں جنہوں نے اس حدیث کے خلاف پوزیشن لی ہے۔ وہ اسے خواتین کو فیصلہ سازی کے حق سے محروم کرنے یا ان کے سیاست سے اخراج کے لئے بنیاد بنانے کو درست عمل قرار نہیں دیتے۔

''تاریخی ریکارڈ درست کرنے کی کوشش کے بعد۔۔۔اس متنازعہ تاریخی حوالے کے رویوں اور شایدین کے سلسلے میں۔۔۔میرا صرف یہ مشورہ ہے کہ اس قسم کے معاملات کو مقدس دلائل قرار دینے، مسلمانوں کو بنیادی سچ کے طور پر بتانے سے قبل اس کے سیاسی و تاریخی مضمرات پر دوبارہ غور کیا جانا چاہئے۔ کیونکہ اس عمل کے نتائج بڑے خوفناک ہو سکتے ہیں۔ تاہم، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس حدیث کا معاملہ ضرور ہے مگر یہ کوئی منفرد واقعہ نہیں ہے۔'' (صفحات 6-44)

علی گڑھ تحریک کے بانی نے ایک صدی قبل حدیث کے بارے میں جو کچھ لکھا اسے پڑھ کر برصغیر میں آج کے مسلمانوں کو صدمہ ہوگا۔'' یہ اسلامی تعلیمات میں سب سے مقدس ہے اس کے باوجود خلفائے راشدین حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے حدیث کی تفسیر کرنے سے منع کر دیا تھا۔ آخر الذکر نے تو اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو کوڑوں کی سزا بھی دی تھی۔ اور ابن مسعود، ابن دردہ اور ابومسعود انصاری کو ان روایات کی تفسیر کرنے پر جیل میں بھی ڈال دیا تھا۔ درحقیقت حضرت ابوبکرؓ نے جو روایات جمع کی تھیں ان سب کو خود انہوں نے جلا دیا تھا۔ اس امر کی شہادت موجود ہے کہ احادیث جمع کرنے کے کام کے آغاز خلیفہ راشد حضرت عمرؓ کے انتقال (644ء) کے بعد ان کے جانشین حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں ہوا۔ (حوالہ حفیظ ملک: سرسید احمد خان کا مذہبی اعتدال، دی مسلم ورلڈ، جلد 54 شمارہ 3، 1964ء، صفحہ 163)۔

ممتاز پاکستانی مفکر حفیظ ملک لکھتے ہیں کہ '' چار فقہی مسالک کی تشکیل سے اجتہاد کا زوال شروع ہو گیا۔'' عوام نے ان

کی اسی طرح اندھی تقلید شروع کردی جس طرح آج تک کی جارہی ہے۔ بہت سے علماء نے غلط احادیث گھڑلیں۔ انہوں نے ایسی 38احادیث کے بارے میں بتایا کہ جن کی فہرست سرسید احمد خان نے 1871ءمیں مرتب کی تھی۔ ان میں سے بعض آج بھی بیان کی جاتی ہیں۔

مرنیسی ایک اور مثال بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ''امام بخاری کی ''مستند'' احادیث میں شامل درج ذیل حدیث بھی دیکھی جاسکتی ہے کہ ''تین چیزیں خراب قسمت کی غماز ہیں، مکان، عورت اور گھوڑا۔'' امام بخاری نے اس حدیث کے دوسرے پہلو شامل نہیں کئے۔ اگرچہ قاعدہ یہ تھا کہ وہ اس کے ایک یا زیادہ متضاد نمونے پیش کرتے تاکہ قارئین کو یہ متضاد صورت حال دکھا کر فیصلہ ان پر چھوڑ دیا جاتا کہ وہ کس پہلو یا نمونے کو درست سمجھتے ہیں۔

''تاہم امام بخاری کی تصانیف میں ایسا کوئی تذکرہ نہیں ملتا جس کے مطابق ''حضرت عائشہؓ نے اس حدیث کی تردید کی ہو۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ کو بتایا کہ ابو ہریرہؓ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ اللہ تعالٰی کے پیغمبرﷺ نے فرمایا کہ ''تین چیزیں خراب قسمت لاتی ہیں: مکان، عورت اور گھوڑا۔'' حضرت عائشہؓ نے اس پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ابو ہریرہ نے اپنے اسباق بہت خراب طریقے سے پڑھے۔ وہ ہمارے گھر میں اس وقت داخل ہوا جب پیغمبر اسلامﷺ ایک جملہ بیان کرتے ہوئے اس جملے کے وسط میں تھے۔ لہٰذا اس نے صرف اختتام سنا پیغمبر اسلامﷺ نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ ''اللہ تعالٰی یہودیوں کی تردید کرے جو یہ کہتے ہیں کہ تین چیزیں خراب قسمت لاتی ہیں: مکان، عورت اور گھوڑا۔''

''امام بخاریؒ نے نہ صرف اس اصلاح کو شامل نہیں کیا بلکہ اس حدیث کو ایسے بیان کیا جیسے اس بارے میں سرے سے کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ انہوں نے تین مرتبہ اس کا حوالہ دیا اور ہر دفعہ روایت کے مختلف سلسلے سے حوالہ دیا۔ یہ طریق کار عام طور پر ایک حدیث کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ امام بخاری نے انہیں خطوط پر ایک اور حدیث کا حوالہ بھی دیا جس میں نسوانیت کے بارے میں یہی نکتہء نظر تباہی اور خراب قسمت کا اشاریہ قرار دیا گیا۔'' پیغمبر اسلامﷺ نے فرمایا: مجھے نہیں پتہ کہ میں اپنے بعد مردوں کے لئے عورتوں سے زیادہ کوئی خطرناک مشکل کا سبب چھوڑوں گا'' وہ خواتین پر اس حدیث کے بارے میں بھی ایک مشکوک ذریعے کا حوالہ دیتے ہیں۔

''اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے؟ یہ کہ مستند حدیث کو بھی محدب عدسے کے ذریعے معائنے اور اس پر گہری تفکر کی ضرورت ہونی چاہئے۔؟ یہ ہمارا حق ہے اور مالکؒ بن انس ہمیں یہ بتاتے ہیں۔ دیگر فقہا کی طرح امام بخاری بھی اپنے کام کا آغاز اللہ تعالٰی سے نصرت طلب کرنے کے ذریعے کیا اور تسلیم کیا کہ صرف اللہ ہی خطاؤں سے مبرا اور

پاک ہے۔ ہر چیز کے بارے میں سوال کرنا ہماری روایت ہے اور ہر فرد خصوصاً فقہا اور آئمہ سوال کرتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ پہلے سے زیادہ اب ضروری ہے کہ ہم اپنی صدیوں کی غلط روایات سے باہر نکلیں اور اصلاح کریں۔ ہمیں عمومیت میں پڑنے کے خلاف بھی محتاط ہونا چاہئے۔ اور یہ کہنے میں احتیاط کرنی چاہئے کہ تمام آئمہ ہی خواتین سے بیزار تھے اور ہیں۔ یہ آج درست ہے نہ کل درست تھا۔ اس کے لئے امام زرکاشی کی مثال موجود ہے جنہوں نے حضرت عائشہؓ کے تمام اعتراضات کے بارے میں لکھتے ہوئے کہا کہ۔۔۔ ''حضرت عائشہؓ نے ابو ہریرہؓ کی اکثر حدیثوں کو متنازعہ قرار دیتے ہوئے اعلان کیا کہ جو کوئی بھی انہیں سننا چاہتا ہے، وہ اچھا سامع نہیں ہے۔ اور جب بھی اس سے کوئی سوال کیا جائے تو وہ غلط جواب دیتا ہے'' (ایضاً صفحات 75-78)

مرنیسی نے پردے کے بارے میں بھی اپنے نقد و نظر میں تفصیل سے لکھا ہے۔ ''اسلام بطور اقدار کے ایک ایسا مربوط نظام ہے جو افراد و معاشرے کے تمام رویوں کا نگران ہے اور محمد ﷺ کے مساوات پسند منصوبے کی بنیاد دراصل ایسی تفصیل پر ہے جسے حضرت عمرؓ کی قیادت میں بہت سے صحابہ ثانوی سمجھتے تھے، عورت کی آزادانہ رائے کا اظہار در اصل ایسی چیز ہے جسے معاشرے کی تنظیم کے لئے مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ کے لئے ح بہت سادہ تھا: ان کی شدید خواہش تھی کہ خواتین کے حجاب ہونا چاہئے۔ انہوں نے پیغمبر ﷺ سے دوبارہ کہا: ''یا رسول اللہ! آپ گھر پر ہر قسم کے افراد سے ملتے ہیں جن میں اچھے اور بُرے دونوں ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ امہات المومنینؓ کے لئے پردے کا حکم کیوں نہیں صادر فرما دیتے؟'' ہر قسم کی تنقید کے باوجود پیغمبر اسلام ﷺ نے حجاب پر رائے دینے سے اجتناب کیا کیونکہ وہ حضرت عمرؓ سے مختلف ذہنیت کے مالک تھے۔ حضرت عمرؓ دلیر، انصاف پسند، دیانتدار، بے لوث اور پاکباز تھے لیکن نرم جوئی اور عدم تشدد جیسی خوبیوں کے حوالے سے ان کے خیالات حضرت محمد ﷺ جیسے نہیں تھے یعنی عمل اور الفاظ میں کسی حد تک اختلاف تھا جو نئے پیغام اور نئے مذہب کے بنیادی عناصر تھے۔

''اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے بے پناہ محبت کے باوجود۔۔۔ جس طرح جذبے اور خلوص سے انہوں نے تمام احکامات پر عمل کیا اور امت ان جذبات کی قدر دان بھی تھی۔۔۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے خواب کا تصور کرنے میں ناکام رہے۔ ایک جنگجو۔۔۔ بہت سے باعمل انسانوں کی طرح۔۔۔ کے طور پر انہوں نے ہر ایک کام کے اثرات یا ردعمل پر غور نہیں کیا جو ایک مخالف میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہمیں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ کوئی عجیب اور سٹریٹجک اعتبار سے خطرناک مشورے دیتے کہ پیغمبر دوسرے صحابہ کی طرف رجوع کر لیتے تا کہ صورت حال کے بارے میں ہر نکتہ نظر سے سوچا جا سکے۔ مثال کے طور پر جنگ حنین کے دوران حضرت عمرؓ نے

قیدیوں کوقتل کرنے کا مشورہ دیا جبکہ پیغمبرﷺ ۔۔دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے ۔۔۔انہیں ترغیب کے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔تاکہ دشمن کواسلام قبول کرنے کی ترغیب دی جا سکے۔

’’محمدﷺ کے اسلام نے نگرانی،کنٹرول کے لئے پولیس کے نظام کے نظریے پر پابندی عائدکی۔اس سے اسلام میں ملائیت کی عدم موجودگی کی وضاحت ہوتی ہےاور تمام مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔کہ وہ لکھے ہوئے لفظ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔انفرادی ذمہ داری کا مقصد حکمران اشرافیہ کے کنٹرول میں توازن پیدا کرنا ہے۔

’’محمدﷺ کی طرف سے ایسے معاشرے کے قیام کے خواب ،جس میں خواتین شہر میں آزادانہ نقل وحمل کر سکیں(کیونکہ سماجی کنٹرول مسلم دین ہوگا جوخواہشات کونظم وضبط کے تحت لائے گا۔)منافقوں کی رسومات، جو خواتین کو ہوس اور تشدد کی چیز سمجھتے ہیں۔کے درمیان جدوجہد میں آخرالذکرنکتہ ءنظر آج بھی رائج ہے۔پردہ منافقین کی فتح کی نمائندگی کرتا ہے۔غلاموں کو ہراساں کیا جاتا اورگلیوں میں ان پر حملے ہوتے تھے۔اس طرح مسلم خواتین کی آبادی حجاب کے معاملے پر دواقسام میں تقسیم ہے۔آزادخواتین جن کے خلاف تشدد ممنوع ہےاور غلام خواتین جن کے لئے تعرض کی اجازت ہے۔حجاب کی منطق میں تشدد کے قانون کواہل ایمان کی دانش سے بدل دیا گیا ہے۔
جسے اللہ تعالیٰ نے خیر وشر میں تمیز کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔اسلام خودکوآیات کا مذہب تسلیم کرانے پرزور دیتا ہے۔
آیات کا ترجمہ قرآن مجید کی آیات بھی کیا جاتا ہےاوراس کے معنی علامات یا نشانی کے بھی ہوتے ہیں۔قرآن ایسی علامتوں کا مجموعہ ہےجن کے اسرار دانش واہل عقل کے ذریعے حل کرنے ہیں ایسی دانش جوفرد کوذمہ دار بلکہ اپنا آقا بناتی ہے۔اللہ تعالیٰ کے لئے اقتدار کا منبع وسرچشمہ رہنے،قانون اور سماجی نظم وضبط کے لئے سماجی اداروں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ پہلے کی طرح یہ فرائض سرانجام دیں جنہیں قبائلی اختیارات کہا جاتا تھااور جوختم ہونا تھے۔اور جن کے لئے ضروری تھا کہ انہیں کنٹرول کے تحت رکھنے کے لئے ایک قبائلی سردار ہونا چاہئے۔

’’حضرت عمرؓ کا حل۔۔۔حجاب کی پابندی رویوں میں تبدیلی کی بجائے خواتین کوڈھانپتی ہےاور جن کے دلوں میں دوسرے کام کرنے کی بیماری ہے۔انہیں ایسے کاموں سے باز رکھنے کی کاوش،اس رویے سے اسلام کا بطور تہذیب پہلو،فرد کے بارے میں خیالات رکھنے والے ادارے اور معاشرے میں افراد کے کردار کا پہلو متاثر ہونا تھا۔خیال و فکر کے اس اجتماع نے جمہوریت اورانفرادی آزادی کی اصطلاحات میں دارالسلام کے قیام کا رضا کارانہ تجربہ کیا۔
حجاب نے مدینہ کوڈھانپ لیااور آزادی کا مختصر،فقہ مزید مختصر کردیا۔ظاہری طور پر،15 صدیاں بعد یہ نوآبادیاتی قوت تھی جس نے مسلم ممالک کو مجبور کیا کہ وہ فرداور خواتین کے حقوق کا سوال دوبارہ زیرغور لائیں۔جمہوریت پر تمام

بحثیں خواتین کے اس سوال سے منسلک ہوگئیں کہ حقوق انسانی کے مخالفین آج یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کپڑے کا یہ ٹکڑا مسلم شناخت کا جوہر ہے۔(صفحات 1884-188)

مرنیسی کی کتاب ''اسلام اور جمہوریت: جدید دنیا کا خوف'' (ایڈیسن۔ویز لے پبلشنگ کمپنی، 1992ء) میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ دیگر دو شخصیات کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔۔ یہ آمنہ ودود اور لیلیٰ احمد ہیں افریقی۔امریکی دانشور آمنہ ودود محسن نے 1972ء میں اسلام قبول کیا۔ اسلامی سائنسز اور عربی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور 1992ء میں ''قرآن اور خواتین'' کے موضوع پر کتاب لکھی۔ وہ اب امامت بھی کراتی ہیں۔

''آمنہ ودود لکھتی ہیں کہ ''تشریحاتی نمونہ متن کے تین پہلوؤں سے متعلق ہے تاکہ اس کے نتائج کی معاونت کرسکے:

(1) وہ تناظر جس میں متن لکھا گیا (قران کے معاملے میں، جس میں یہ نازل ہوا)؛

(2) متن کی گرائمر کے لحاظ سے تالیف، (یہ کیسے کہتا ہے)؛ اور

(3) پورا متن اور اس کا دنیا کے بارے میں نکتہ نظر۔ اکثر اختلاف رائے کو ان تین پہلوؤں کے مابین زور میں تنوع سے ڈھونڈا جاسکتا ہے۔

''میں بحث اور آفاقی رہنمائی کے تقاضے پورے کرنے کے لئے بعض روایتی تشریحات بالخصوص قرآن میں استعمال کئے گئے بعض الفاظ کے خلاف دلیل دیتی ہوں۔ میں بعض اوقات صنفی بحث میں غیر جانبدارانہ اصطلاحات کی بات کرتی ہوں۔ دیگر بحثوں میں، جنہیں آفاقی سمجھا جاتا ہے، میں ان کی حدود اور 17ویں صدی کی عرب دنیا کی خصوصی اصطلاحات کے اظہار کی بنیاد پر خصوصی تذکرہ کرتی ہوں۔ یہاں نزول قرآن اور اس عمومی عرصے کے حوالے سے بعض تاریخی معلومات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اس طرح میں قرآنی تشریحات کا وہ طریقہ استعمال کرنے کی کوشش کرتی ہوں جسے فضل الرحمٰن نے تجویز کیا تھا۔ (پاکستان۔امریکہ۔1919ء۔1988ء)۔ ان کے مطابق قرآن مجید کے تمام پیراگراف تاریخ کے جس مخصوص وقت میں اور بعض عمومی وخصوصی حالات میں نازل ہوئے۔ ان میں بیان کردہ حقائق اس عہد کے حالات سے متعلق تھے۔ تاہم تاریخی طور پر قرآن کا پیغام اس عہد یا ان حالات تک محدود نہیں ہے۔ ایک قاری کو اس وقت کے دوران قرآنی اظہار کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے جن میں وہ بیان کئے گئے تاکہ وہ موزوں معانی کا تعین کرسکے۔ یہ معنی کسی مخصوص آیت میں بیان کئے گئے احکامات یا اصولوں کی درست وجہء نزول بتاتے ہیں۔'' (کرزمان؛ صفحہ 129)

لیلیٰ احمد قاہرہ میں پیدا ہوئیں، انہوں نے کیمبرج سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور ہارورڈ میں پروفیسر تعینات

ہوگئیں۔ 1992ء میں ان کی کتاب ''اسلام میں خواتین اور صنف: جدید بحث کی تاریخی جڑیں''(ییل یونیورسٹی پریس) شائع ہوئی۔جان آر مجانی نے ان کے خیالات کا خلاصہ یوں کیا ہے۔''لیلیٰ احمد کے لئے قرآن کے دو مرکزی پیغامات انصاف اور مساوات سے متعلق ہیں۔انہیں یقین ہے کہ ان دو خوبیوں کے معانی نزول کے اس مفہوم کے مطابق ہیں جو حضرت محمدﷺ پر نازل ہو؛ یہ ایسی خوبیاں ہیں جن کے مطابق مسلم معاشرے کے لئے معیار مقرر کونے چاہیئے تھے۔

لیلیٰ احمد اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ سورۃ 33:35 میں برملا دعویٰ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرد اور عورت برابر ہیں؛ نیکیوں اور اخلاقی اعزازات حتیٰ کہ اجر و ثواب میں بھی، ایک صنف میں بھی وہی خوبیاں اور نیکیاں جو دوسری میں ہیں۔اس سورۃ میں انسانی اخلاقی احوال اور صنف سے قطع نظر افراد کی روحانی شناخت اور مشترکہ اخلاقی ذمہ داریوں کی حتمی شناخت کے حوالے سے بڑا واضح بیان دیا گیا ہے۔اس کے باوجود لیلیٰ کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد اسلام پھیلا اور اس میں ادارے قائم ہوگئے تو پھر اس مساویانہ اخلاقیات کو فراموش کر دیا گیا۔ یا ''قیام اسلام'' کے خاندانی ڈھانچوں میں شریک افراد نے اسے دانستہ نظر انداز کر دیا۔لیلیٰ کا کہنا ہے کہ تاریخی اعتبار سے اسلام کے اندر کم از کم دو نمایاں آوازیں تھیں اور صنف کی تقابلی تفہیم کے دو مطلب تھے۔ایک معاشرے کے عملی قواعد اور ضوابط کے اظہار میں اور دوسرا اخلاقی نکتۂ نظر کی تشکیل میں۔وہ کہتی ہیں کہ معاشرے کے عملی قواعد وضوابط سے منسلک اسلام کی آواز کو چونکہ زیادہ وضاحت کے ساتھ سیاسی اور قانونی نظام میں بیان کر دیا گیا ہے اور اسے ہی اسلام کی تکنیکی تفہیم کہا جاتا ہے، جبکہ دوسرے آواز میں اسلام کے مساوات پر مبنی اخلاقی نکتۂ نظر کا دعویٰ کیا گیا ہے اور اس کے اسلام کے سیاسی و قانونی ورثے پر اثرات کو بہت کم دیکھا گیا ہے۔(جان آر مجانی: متحرک اسلام: تبدیلی کے عہد سے معتدل مسلم نکتۂ نظر؛ یونیورسٹی پریس آف امریکہ، 2004، صفحات 41-42)

دو دیگر شخصیات کا تذکرہ بھی ضروری ہے فرید اسحاق عالمی سطح پر معروف جنوبی افریقی مسلم مفکر اور ایسے رہنما ہیں جنہوں نے اسلامی حریت کا نظریہ پیش کرنے کی پاداش میں جیل کی سزا بھی کاٹی۔انہوں نے نیلسن منڈیلا کی حکومت میں صنفی مساوات کے کمشنر کے طور پر خدمات بھی سرانجام دیں۔اس سے جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کو حوصلہ ملنا چاہیئے کہ وہ ایسی مذہبی قیادت کی حمایت سے دستکش ہو جائیں جس نے آزادی سے لے کر اب تک ان کے مسائل اور شکایات کے حل کے لئے کچھ نہیں کیا۔انڈین مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ سیکولر سیاست میں زیادہ جارحانہ انداز سے حصہ لیں اور بطور مسلم اپنے حقوق پر زور دیں اور ان کا دفاع کریں۔

میں اسحاق کی کتاب سے اس قدر مفصل اور مؤثر پیرا گراف پیش کرنے پر معذرت خواہ نہیں ہوں۔''1984ء میں سہ فریقی نظام متعارف ہونے اور ملک بھر میں یقینی مغاوت کا ماحول مسلمانوں کے لئے ایک اشارہ تھا۔ کہ وہ نسلی امتیاز کے علم برداروں سے قطع تعلق کر کے مظلوموں کے ساتھ کھڑے ہو جائیں۔ یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ نے سہ فریقی نظام کے خلاف جب تمام عوام کو متحد کرنے کا نعرہ لگایا تو حسن سلمان، شیخ عبدالقمیت کبیر، ابراہیم رسول اور راقم الحروف جیسے مسلم رہنماؤں نے اس نعرے کی کشش کو محسوس کیا۔ اس فرنٹ نے ایسے حالات تخلیق کئے جن کے تحت معاشرے کے تمام طبقات اپنی انفرادی شناخت برقرار رکھتے ہوئے اس جدوجہد میں حصہ لے سکتے تھے کیونکہ یہ ایک سیاسی محاذ تھا۔ ابراہیم رسول نے ایک سیاسی تنظیم اور مذہبی آگاہی کے درمیان تعلق کو درج ذیل طریقے سے بیان کیا۔''یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ نے ہمیں بتایا کہ ایسے حالات پیدا کرنے کے لئے معاشرے کے نچلے طبقے کی بہت سی تنظیموں کی ضرورت ہے جس کے ذریعے مسلمان اس جدوجہد میں اپنا جائز مقام حاصل کر سکیں۔ ایسا صرف قرآن مجید کی کسی ایک اپیل سے نہیں ہوگا کہ مسلمانوں کے اندر انقلابی پیدا کئے جا سکیں۔ یہ سماجی حالات، مذہبی تعلیمات اور تنظیم کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ان کا بیان اہم ہے کیونکہ یہ قرآن کے نظریہ حریت اور جنوبی افریقہ میں ابھرتے ہوئے اسلامی افکار کی بنیاد پر ہے۔ سماجی طور پر مفید اور با مقصد بننے کے لئے تاریخ میں قرآن مجید موجودہ عہد کی ضرورت ہے۔ اس قسم کا ایک لمحہ مظلومیت اور حریت کے لئے جدوجہد کے تناظر میں تشکیل پا رہا تھا۔ یہ ایک ایسی جدوجہد تھی جس میں اسلام کے علاوہ دیگر ادیان کے پیروکار بھی شریک تھے۔''

ان کے خیالات ہمارے معاشرے سمیت تمام دیگر اجتماعیت پسند معاشروں سے بھی متعلق ہیں۔''میرے لئے حریت کا مذہبی نظریہ وہ ہے جو مذہب کو سماجی، سیاسی، مذہبی ڈھانچوں اور غیر تنقیدی تقلید کی بنیاد پر تشکیل پانے والے نظریات سے آزادی دلانے کے لئے کام کرے۔ یہ عوام کو ہر قسم کی ناانصافی اور ذات، نسل، صنف، طبقے اور مذہب سمیت ہر قسم کے استحصال سے محفوظ بنائے۔ حریت کا مذہبی نظریہ ایسے عمل کے لئے اپنا اہداف کے حصول کی کوشش کرتا ہے جو کہ شراکتی اور حریت پسندانہ ہو، اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ یہ ایسی سماجی و سیاسی حریت کے ساتھ یکجہتی کے لئے تشکیل پاتا ہے جن کی ذاتی حریت اس عمل میں شراکت کے ذریعے حقیقی بن جاتی ہے۔ مزید برآں حریت کا اسلامی نظریہ قرآن اور تمام انبیاء کی جدوجہد سے قوت حاصل کرتا ہے۔ یہ اس عمل کے لئے قرآنی تعلیمات اور انبیاء کی مثالوں سے رہنمائی حاصل کرتا ہے اور موجودہ عہد میں حریت کے تقاضوں کے مطابق کام کرتا ہے۔'' (بحوالہ ان کی کتاب، قرآن؛ استعمال کنندہ کے لئے رہنمائی؛ ایک دنیا، آکسفورڈ 2005ء اور قرآن، حریت اور اجتماعیت۔ ظلم

کے خلاف بین المذاہب یکجہتی کا اسلامی نکتہ نظر؛ ون ورلڈ آکسفورڈ 2006ء) ترک مفکر مصطفیٰ اکیول کی کتاب نہ صرف ترکی میں ہیجان کی وضاحت کرتی ہے بلکہ اس بات پر بھی روشنی ڈالتی ہے کہ اسلامی فکر منجمد کیوں ہوئی (انتہاؤں کے بغیر اسلام: آزادی کے لئے ایک مسلمان کا مقدمہ؛ ڈبلیو۔ڈبلیو نورٹن اینڈ کمپنی؛ 2011ء تاریخ اور دینیت پر ایک عمدہ تصنیف ہے جس میں سر سید احمد خان اور علامہ اقبال کو دہرایا گیا ہے۔

جنوبی ایشیاء، جہاں وہ پیدا ہوئے ہیں، نے لگتا ہے کہ انہیں فراموش کر دیا۔ انہوں نے اسلامی دنیا میں دیگر مقامات پر اس علمی ہیجان میں اہم کردار ادا کیا ہے لیکن ان کی جنم بھومی آج بھی علمی انجماد کا شکار ہے۔

سائبر سیکورٹی اور سائبر جنگ: پاکستان کہاں کھڑا ہے؟

بریگیڈئیر (ر) محمد یاسین

خلاصہ (Abstract)

انٹرنیٹ کا بڑھتا ہوا استعمال اور ہر ایک کے لئے یہ مفت دستیاب ہونے سے سائبر کی وسعت میں بہت اضافہ ہو چکا ہے۔اس وجہ سے ہیکرز (Hackers) کے لئے انفرا سٹرکچرز اور خدمات کو ٹارگٹ کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔دشمنوں آئندہ کی جنگ کے درمیان سائبر جنگ ہو گی۔ وہ ملک جس کے پاس اس جنگ کی صلاحیت بہت زیادہ ہو گی وہ میدان جنگ میں جائے بغیر لڑائی جیت جائے گا۔ یہ مقالہ مختلف قسم کے سائبر خطرات، سائبر حملہ آوروں کو حاصل فوائد، سائبر حملوں کی اقسام،

(CIA) اعداد وشمار کی معلومات ان کے تحفظ، نہیں خفیہ رکھنے کی ضمانت، کلیت اور دستیابی جیسے موضوعات پر روشنی ڈالے گا۔سائبر حملوں کے کون سے ٹارگٹ ہو سکتے ہیں اور سائبر جنگ میں کس قسم کی قیادت کی ضرورت ہو گی۔ان موضوعات کو بھی زیر بحث لایا جائے گا۔اس سٹڈی کا مقصد پالیسی سازوں اور باقی سٹیک ہولڈرز کو یہ باور کرانا ہے کہ سائبر خطرات حقیقی طور پر موجود ہیں ۔اس مقالے میں چند سفارشات بھی دی گئی ہیں۔جن پر عمل کر کے ان خطرات کو ختم تو نہیں لیکن کم کیا جا سکتا ہے۔آخر میں چند ایک ایسی سفارشات درج کی گئی ہیں جو خاص طور پر پاکستان کے لئے ہیں کہ ہمیں ان خطرات کو کم کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔

1۔ تمہید

وسیع تر اور تیزی سے پھیلتی ہوئی سائبر سپیس اور شدت اختیار کرتے ہوئے سائبر حملے عالمی معیشت کے لئے نہایت خطرناک ثابت ہورہے ہیں۔ بعض سٹڈیز کے مطابق 2017ء میں عالمی معیشت کو 450ارب امریکن ڈالر کا نقصان ہوااور تخمینے کے مطابق 2019 میں یہ خسارہ 2000 ارب ڈالرز تک پہنچ جائے گا۔ چونکہ غیر موذونیت اور گمنامی سائبیر کے جزو بن گئے ہیں اور یہ پتہ لگانا بہت مشکل ہے کہ ان حملوں کے پیچھے کون ہے۔ اس لئے مشترکہ بین الاقوامی کوششیں ہی اس خطرے کو کم کرسکتی ہیں۔ 2016 میں امریکہ کے صدر بارک اوبامہ نے اس خطرے سے نپٹنے کے لئے قومی ایمرجنسی کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا:

The increasing prevalence and severity of malicious cyber enabled activities constitute an unusual and extraordinary threat to the national security, foreign policy and economy of the United States. I, hereby declare National emergency to cope with the threat

تیزی سے پھیلتی ہوئی سائیبر سپیس کو بہت زیادہ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور ٹیلی کمیونیکیشن کے استعمال کی ضرورت ہے اسی وجہ سے ہیکرز کے لئے اس ٹیکنالوجی کو آزادانہ استعمال کرتے ہوئے سائیبر حملوں کو آسان بنادیا ہے۔ تصور کریں کہ اگر آپ کا بنکنگ ،بجلی ،ٹرانسپورٹ اور ملٹری کمانڈ اور کنٹرول سسٹم کو ناکارہ بنادیا جائے تو آپ کے ملک کی کیا حالت ہوگی۔ حالیہ سالوں میں سائیبر حملہ آوروں نے تاوان کے سوفٹ ویئر کو استعمال کرتے ہوئے اپنے شکار سے اربوں روپے چھینے ہیں۔ ان وجوہات کے باعث تمام ممالک بالخصوص ترقی پذیر ملک جن میں پاکستان بھی شامل ہے، کے لئے ضروری ہے کہ ان حملوں سے دفاع کے لئے نہ صرف صلاحیت حاصل کریں بلکہ اس قابل بھی ہوں کہ جوابی حملے کرسکیں۔ یہ کہنا تو آسان ہے مگر کرنا بہت مشکل ہے۔ انٹرنیٹ ایک بہت بڑی سہولت ہے جو کہ ہر ایک کو دستیاب ہے اس کو استعمال کرتے ہوئے سائیبر حملہ آور اپنی پہچان کو خفیہ رکھ سکتے ہیں اور اگر ریاست ان حملوں کے پیچھے ہو تو یہ اور بھی خطرناک ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہمارے جیسے ملک کے پاس ان کا سامنا کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔

سائبر سے تحفظ کو کئی طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔اس کی ایک تعریف یہ ہے:

The body of technologies, processes and practices designed the protect networks, computers, programs and data from attacks, damage or unauthorised access. In a computing context, security includes both cyber security and physical security.

اس کو CIA Triad (Confidentiality, integrity, availability) بھی کہا جاتا ہے۔اس کو امریکن سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی کے ساتھ confuse نہ کیا جائے ۔سائبر سیکورٹی ایسی ہونی چاہئے جس سے کمپیوٹر انفراسٹرکچر، سوفٹ ویئر،نیٹ ورکس اور ملٹری کمانڈ اور کنٹرول سسٹم کو نقصان نہ پہنچے۔

ٹیکنولوجی اس رفتار سے ترقی کر رہی ہے کہ گھریلو استعمال کے آلات بھی ان خطرات سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔اس مقالے میں سائبر حملوں کی اقسام،سائبر خطرات،حملہ آوروں کو جو آسانیاں حاصل ہیں اور ممکنہ ٹارگٹ ہو سکتے ہیں اور ان خطرات کو کیسے کم کیا جا سکتا ہے اور پھر ہمیں کیا تیاریاں کرنی چاہئیں۔ان کے متعلق سفارشات پیش کی گئی ہیں جو کہ پالیسی سازوں اور باقی سٹیک ہولڈرز کے لئے کارآمد ہوسکتی ہیں۔اس پیپر میں یہ تذکرہ بھی ہے کہ پاکستان اس وقت کہاں کھڑا ہے اور ہمیں آگے کیا کرنا ہے۔

2۔ سائبر حملوں کی چیزیں جس سے سائبر حملہ آور فائدہ اٹھاتے ہیں

کچھ لٹریچر میں ان حملوں کی مندرجہ ذیل اقسام بیان کی گئی ہیں جس سے حملہ آور فوائد حاصل کرتے ہیں:

2.1 راز میں رکھنا Confidentiality

انٹرنیٹ کا ربط باہم (extensive connectivity) اور ناقص سیکورٹی کی وجہ سے ہیکرز اہم انفارمیشن چرا سکتے ہیں۔confidentiality سے یہ مراد ہے کہ ایسے لوگ جو انفارمیشن حاصل کرنے کے مجاز نہیں ہیں وہ معلومات تک رسائی حاصل نہ کرسکیں۔انفارمیشن ہتھیائی نہ جاسکے اور کوڈز کو توڑا نہ جاسکے۔اگر confidentiality قائم نہ رہ سکے تو سول اور ملٹری اداروں کو بہت خطرہ ہوسکتا ہے اور اگر خفیہ انفارمیشن مثال کے طور پر لڑاکا طیاروں کے ڈیزائن،میزائلز،انڈسٹریل پلانٹس اور انٹلیکچوئل پراپرٹی بڑے پیمانے پر چوری سے حاصل کرلی جائے تو اس سے ملک بڑے خطرے سے دوچار ہوسکتا ہے۔

2.2 Integrity

مجاز اختیار کے بغیر انفارمیشن کوڈ تبدیل کر دینا، ڈیٹا کو Sabotage کر دینا اور اس کو سیاسی، ملٹری اور مجرمانہ مقاصد کے لئے استعمال کرنا شامل ہیں۔ سرکاری ویب سائٹس میں غلط انفارمیشن شامل کی جا سکتی ہے اور ایسی انفارمیشن عمودی (Vertically) اور افقی (horizontally) چلائی جا سکتی ہے۔ ہتھیاروں کے نظام کو غلط کمانڈ دی جا سکتی ہے۔ سیکورٹی رکاوٹوں کو مجرموں اور دہشت گردوں کے لئے توڑا جا سکتا ہے۔

2.3 دستیابی Availability

سائبر حملہ آور مجاز عملے کے لئے جنہوں نے کام سرانجام دینا ہوتا ہے اور سسٹم کو چلانا ہوتا ہے ان کو اپنے کام سے روک دیتے ہیں۔ اسے خدمات سرانجام دینے سے روکنا Denial of Service (DOS) بھی کہا جاتا ہے۔ DOS اگر بنکنگ سسٹم یا ٹرانسپورٹ سسٹم کو ناکارہ کر دے تو اس کے منفی قسم کے نتائج ہو سکتے ہیں۔

3۔ سائبر خطرات CyberThreats

کسی بھی ہیکر کے مندرجہ ذیل مقاصد ہو سکتے ہیں:

3.1 سراغ رسانی Espionage

اس کا مقصد حساس قسم کی معلومات کو چوری سے حاصل کرنا، سیاسی اور ملٹری کمیونی کیشن تک رسائی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ یہ الگ تھلگ طریقوں سے حاصل کی جاتی ہے اور دنیا کے کسی بھی حصے سے کی جا سکتی ہے۔ تخریب کار مسلسل ایک دوسرے کی انٹیلی جنس حاصل کر کے اس کی معیشت کو نقصان پہنچاتے ہیں اور جنگی تیاریوں پر نظر رکھتے ہیں۔ ایسی سراغ رسانی سے شکار ملک کے لئے بہت دشواریاں اور مصیبتیں کھڑی کی جا سکتی ہیں۔

3.2 پراپیگنڈہ

اس کا مقصد دشمن ملک میں انٹرنیٹ اور دوسرے مواصلاتی ذرائع کو روک کر جھوٹی اور من گھڑت خبریں پھیلانا ہوتا ہے۔ ایسی خبریں دشمن کی لائینوں کے پیچھے پھیلانے سے کنفیوژن پھیل جاتی ہے جس سے آبادی اور فوج کا حوصلہ پست ہو جاتا ہے۔ اگر پراپیگنڈہ کو صحیح طور پر پلان کیا جائے تو اس سے دشمن ملک میں غیر یقینی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ (2017) Randal Marlin نے پراپیگنڈہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

"The organized attempt through communication to affect belief or action or inculcate attitudes in a large audience in ways that circumvent or suppress an individual's adequately informed, rational, reflective judgement.

مستقبل کے کسی بھی تصادم میں سائیبر سپیس کا استعمال کرتے ہوئے دشمن ملک میں جھوٹی افواہیں پھیلا کر مقصد حاصل کیا جاتا ہے۔ملک کے اندر سے بھی انتہاپسند اور دہشت گرد بڑی آبادی کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔اس سے ملک میں کنفیوژن اور غیر یقینی کی حالت پیدا ہوسکتی ہے۔کہا جاتا ہے کہ ہٹلر پروپیگنڈہ کی جنگ میں جھوٹی خبریں پھیلانے میں بہت ماہر تھا۔ایسے پروپیگنڈے کے اثرات زائل کرنے کے لئے victim ملک کو بہت سے ذرائع بروئے کار لانا پڑتے ہیں جو کہ کئی دفعہ میسّر نہیں ہوتے۔

3.3۔ خدمات سرانجام دینے سے روکنا Denial of Service (DOS)

اس کا مقصد شکار کو ایسی انفارمیشن یا سروس جو اس کے لئے ضروری ہو اس سے محروم کرنا ہوتا ہے۔اس سے ڈیٹا اور کمپیوٹر بھی متاثر کئے جاتے ہیں۔الیکٹرانک انفارمیشن، کرنٹ اور وولٹیج کی سرجز پیدا کر کے یا سروس دینے والے آلات کو تباہ کر کے بھی یہ مقصد حاصل کیا جاتا ہے۔بنکنگ سروسز، بجلی، گیس اور ٹرانسپورٹ سروسز سے محروم کیا جاتا ہے۔اس کا مطلب دشمن بغیر لڑائی کے اپنا مقصد حاصل کرنا ہوتا ہے۔

3.4۔ اعداد وشمار میں ترمیم Data Madification

اس کا مقصد حساس اور اہم ڈیٹا کی سالمیت کو کمپرومائز کرنا ہوتا ہے۔یہ ویب سائٹ میں نقص ڈال کر اپنی طرف سے جعلی ڈیٹا ڈال دیا جاتا ہے جس سے شکار کا ڈاٹا بیس غلط معلومات دیتا ہے۔یہ نہایت ہی خفیہ انداز سے کیا جاتا ہے۔ اس سے پلاننگ اور اس پر عمل درآمد بری طرح متاثر ہوتا ہے۔

3.5 انفراسٹرکچر میں ردّوبدل Infrastrucute Manipulation

اس کا مقصد اہم قسم کے انفراسٹرکچرز مثلاً الیکٹرک گرڈ اور کمپیوٹر نیٹ ورک کو نشانہ بنانا ہوتا ہے۔یہ سروس مہیا کرنے والے بھی کر سکتے ہیں۔کسی مجاز اختیار کے بغیر سول اور ملٹری انفراسٹرکچر کو ردوبدل پیدا کرنے سے خطرناک حالات پیدا ہوں گے۔اور ایسا اثر دور کرنے کے لئے بہت سے ذرائع اور وقت درکار ہوتا ہے۔یہ طریقہ کار اداروں کے ڈیٹا بیس اور مشینوں میں نقائص ڈال کر غلط ڈیٹا اور انفارمیشن کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال کر شکار کے لئے بہت سی

مشکلات پیدا کی جاتی ہیں۔ جب تک شکار کو پتہ نہ چلے کہ اس کا ڈیٹا بیس یا آلات کی کارکردگی تبدیل کر دی گئی ہے، اس وقت تک وہ غلط قسم کے فیصلے کرتا رہے گا جس سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔

4۔ سائبر حملہ آوروں کو جو آسانی حاصل ہے

انٹرنیٹ کی ساخت اور جس میڈیم سے انفارمیشن گزرتی ہے اس سے سائبر حملہ آوروں کو بہت آسانی پیدا ہوتی ہے۔ (Geass(2011 کے مطابق ایسے حملہ آوروں کو مندرجہ ذیل آسانیاں میسر ہیں:

4.1 Vulnerability

انٹرنیٹ کی مکئی نما ساخت کی وجہ سے ہیکرز کے لئے اس میں کئی راستوں سے داخل ہونا آسان ہے۔ کمیونیکیشن ٹیکنالوجی اس قدر پھیل چکی ہے کہ اب سائبر حملے آسان ہو گئے ہیں جب تک انٹرنیٹ کو محفوظ نہیں کر دیا جاتا یہ آسانی میسر رہے گی۔ انٹرنیٹ سب کو یکساں طور پر مہیا ہے۔ اس میں کسی کو کوئی رعایت نہیں جو چاہے اور جس وقت چاہے استعمال کر سکتا ہے۔

4.2 بے جوڑ پن Asymmetry

سائبر حملے مختلف نوعیت اور اقسام کے ہوتے ہیں۔ ہر حملہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اس لئے اس کے پیٹرن کا تعین بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ معلوم کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے کہ حملہ آور اگلا حملہ کس طریقے کا کرے گا۔ اس کی عادت کا پتہ نہیں چلتا۔

4.3 گم نامی Anonymity

انٹرنیٹ کا پھیلاؤ اور اس کی ساخت سائبر حملہ کرنے والوں کو سہولت مہیا کرتی ہے کہ وہ حملہ ایسے ملک کے راستے سے کریں جس کے ساتھ شکار ملک کے تعلقات کشیدہ ہوں۔ حملہ آور کی شناخت تقریباً ناممکن ہوتی ہے۔ اس لئے ایسے حملہ آور محفوظ رہتے ہیں۔ 2010ء میں امریکہ اور اسرائیل نے ایک ایسا malware استعمال کیا جو کہ stuxnet کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کا یہ حملہ ایران کی ایٹمی تنصیبات پر تھا۔ اس کی وجہ سے ان کی مشینیں کبھی آہستہ ہو جاتی تھیں اور کبھی بہت تیز ہو کر جل جاتی تھیں۔ ایرانی یہ پتہ کرنے کے قابل نہیں تھے کہ ہو کیا رہا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ سسٹم میں کوئی خرابی ہے۔

4.4 سائبر حملوں سے دفاع کی ناکافی صلاحیت Inadequacy of Cyber Defence

سائبر حملہ آوروں کو جو فائدے میسر ہیں اور جب کہ ایسے حملوں کی روک تھام کے لئے کوئی بین الاقوامی قانون موجود نہیں ہے تو مما لک کے لئے ایسے حملوں سے دفاع میں بہت مشکلات ہیں۔اداروں کے لئے دفاعی قابلیت حاصل کر نا مشکل ہے۔ٹیکنیکل ماہرین کی بہت کمی ہے اور جو ہیں ان کو زیادہ دیر رکھنا بہت مشکل ہے۔کیونکہ ان کی سر کولیشن ویلیو بہت زیادہ ہے۔اگر چہ ترقی یافتہ مما لک میں اب کچھ یونیورسٹیاں ان مضامین کو اپنے پروگرام میں شامل کرتی ہیں مگر اس کے باوجود سائیبر دفاعی ماہرین کی کمی ہے۔

4.5 غیر ریاستی عناصر کا اُبھار Rise of Non-State Actors

انٹرنیٹ ہر ایک کو میسر ہے اور ہیکرز کے لئے Asymmetry جیسے فائدے موجود ہیں۔اس لئے سائیبر حملہ آوروں کے لئے سراغ رسانی، پروپیگنڈہ، جرائم اور عسکری جارحیت جیسے حربے استعمال کرنا آسان ہے۔انٹرنیٹ کا غیر قانونی استعمال روکنے کے لئے کوئی بین الاقوامی قانون موجود نہیں ہے۔اس لئے غیر ریاستی عناصر مثلاً سول سوسائٹی، سوشل گروپ، انتہا پسند اور دہشت گرد اپنے مذموم مقاصد کے لئے انٹرنیٹ کا استعمال کر سکتے ہیں۔یہ لوگ اپنے آپ کو قانون کا پابند نہیں سمجھتے۔دہشت گرد تنظیمیں اس قسم کے حربوں کے استعمال میں بڑی صلاحیت رکھتی ہیں۔یہ لوگ ملک کے پاور گرڈ، ٹرانسپورٹ اور بنکنگ سسٹم کو ناکارہ بنا سکتے ہیں۔یہ حساس انفارمیشن اور ملک کے خفیہ پلانوں کو چُرا سکتے ہیں۔ایسے لوگ دشمن ملکوں کے ساتھ آسانی سے ملے ہوتے ہیں۔مندرجہ ذیل فگر سائیبر حملہ آوروں کو حاصل آسانیوں کو اجاگر کرتی ہے۔

Key Cyber-attack advantage

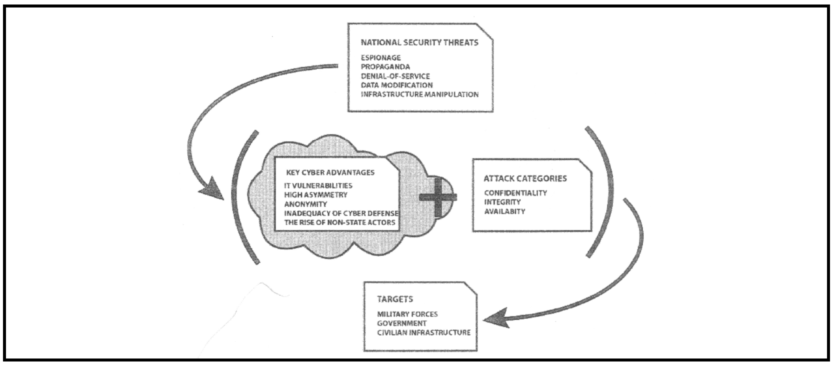

Source: Geers (2011)

5۔ سائبر حملوں کے شکار

Geers (2011) کے مطابق حکمت عملی کی طرز کے سائبر حملے عام طور پر یا روزانہ نہیں ہوتے بلکہ ہوسکتا ہے کہ زیادہ طاقت والے سائبر ہتھیار فوجوں نے یا انٹیلی جنس ایجنسیز نے بین الاقوامی تصادم اور جنگ میں استعمال کے لئے رکھے ہوں۔ مستقبل کی جنگ میں یہ ہتھیار لازمی طور پر استعمال ہوں گے۔ کچھ ادارے یہ ہتھیار استعمال کریں گے جب کہ وہی پھر ایسے ہی حملوں کا نشانہ بنیں گے۔ ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہدف ہوسکتے ہیں۔

5.1 فوجی قوت ملٹری فورسز

سائبر حملوں کا مقصد دشمن کی افواج کے ہتھیاروں کے نظام کو بے کار بنانا اور اس کے کمانڈ اور کنٹرول سسٹم میں DoS کا حربہ استعمال کرتے ہوئے انہیں ناکارہ بنا دینا ہوتا ہے۔ اس کا مقصد اسے تباہ کرنا، اس میں افراتفری پیدا کرنا، اس کی حیثیت کم کرنا اور دھوکہ دینا ہوتا ہے۔

افواج اپنے سسٹم کو ایسے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اقدامات کریں گی۔ اکثر افواج اپنے مخالف ملک کی صف بندی، صف آرائی، لاجسٹکس، فراہمی اور رتیاری کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں رہتی ہیں۔ امریکی افواج اور اس کا محکمہ دفاع نتیجہ خیز قسم کی مشقوں میں مصروف رہتا ہے۔ اس وقت امریکہ کے پاس ایسے حملوں کی اچھی قابلیت موجود ہے۔

ابھی ایٹمی جنگ کا تصور تقریباً ختم ہوتا جا رہا ہے کیونکہ ایٹمی ہتھیار تباہ کئے جا سکتے ہیں۔ مگر سائبر ہتھیاروں کے بے جوڑ پن اور گم نامی کے باعث اور ان کی ساخت کی وجہ سے تباہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کسی بھی آئندہ جنگ میں ملٹری کمانڈ اور کنٹرول سسٹم سب سے اہم نشانہ ہوگا اسی وجہ سے امریکہ اور کئی دوسرے ملکوں نے ایسے خطرات سے نپٹنے کے لئے انتظامات کر رکھے ہیں۔

5.2۔ حکومتی اور شہری انفراسٹرکچر

اس میں حریف کا نشانہ مالی سیکٹر۔ انڈسٹری، ٹرانسپورٹ اور پاور گرڈ ہو سکتے ہیں اگر ان کو ناکارہ بنا دیا جائے تو حکومت کا کام بہت زیادہ متاثر ہوسکتا ہے۔ اس سے فیصلے کرنے کی صلاحیت بہت متاثر ہوگی اور جس ملک پر حملہ ہوگا وہ زیادہ دیر تک مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔ اس وجہ سے قوم کا حوصلہ ختم ہو جائے گا اور حملہ آور لڑے بغیر ہی کامیاب ہو جائے گا۔

6۔ سائبر قیادت

فرانسسکا سپڈالیری Francesca Spidaleri کے مطابق سائبر دفاع کے لئے صرف انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ماہرین جن کے پاس کمپیوٹر سائنس، الیکٹریکل انجینئرنگ اورسوفٹ ویئر کا ہی علم ہو کارآمد نہیں ہیں بلکہ ایسے پیشہ ور ماہرین جو سیاسی، اداراتی، نفسیاتی، اخلاقی نظریے، بین الاقوامی قوانین اور سماجی علوم سے آگاہ ہوں، کارآمد ہو سکتے ہیں۔اس وقت اس شعبے میں ایسے لیڈر ہیں جن کے پاس سائبر معاملات کا بہت کم علم یا تجربہ ہے۔

امریکہ کی ڈیفنس سائبر کمیٹی نے سائبر لیڈروں میں مندرجہ ذیل پہلوؤں کے حوالے سے علم، تجربہ اور قابلیت پر زور دیا ہے۔

- سائبر لیڈر کو ٹیکنیکل توقعات پر پورا اترنا چاہئے
- اس کو ایگزیکٹو مینجمنٹ کی صلاحیت ہونی چاہئے تاکہ وہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ساتھ اور دوسرے سٹیک ہولڈرز کے ساتھ معاملات کو دیکھ سکے۔
- اس میں سائبر کے متعلق بہت اچھی قابلیت ہونی چاہئے تاکہ وہ ٹیکنیکل نوعیت کے مسائل کے فیصلے کر سکے جو کہ ادارے کے لئے ضروری ہوں۔
- اکیڈمک انسٹی ٹیوشنز اور یونیورسٹیوں کو اس میدان میں اپنا کام سرانجام دینا ہوگا۔امریکہ اور بعض ترقی یافتہ ممالک میں یہ مضامین پڑھائے جا رہے ہیں اور اسی شعبے میں سائبر لیڈر تیار کئے جا رہے ہیں۔ ایسے لیڈر جو صحیح طور پر سائبر کے مشکل معاملات سینئر لیڈروں کے سامنے اس طریقے سے رکھ سکیں کہ ان کو پوری طرح سے حالات کا پتہ چل سکے۔ایک ایسے پروگرام کی ضرورت ہے جو ایسے لیڈر تیار کر سکے جو کہ پہل کاری اور تنوع سے دوررس قسم کے فیصلے کر سکیں۔

افسوس کی بات ہے کہ پاکستان میں ایسی کوئی یونیورسٹی نہیں جو ایسے پروگراموں کے ذریعے سائبر لیڈر تیار کر سکے۔

7۔ سائبر جنگ میں عسکری قیادت

سن زو کی جنگ کی ڈاکٹرائن بھی سائبر جنگ کے لئے موزوں ہے گو کہ یہ تصور اس نے 2,500 سال پہلے استعمال کیا تھا۔اس نے ملٹری کمانڈروں کو یہ نصیحت کی تھی کہ دشمن کی غیر ضروری تباہی سے گریز کریں۔ بہترین لیڈر وہ ہوتے ہیں جو بغیر جنگ کے فتح حاصل کر لیں۔اس لئے جنگ لڑ کر جیتنا بہترین کارکردگی نہیں ہے۔بہترین کارکردگی

یہ ہے کہ بغیر جنگ کئے دشمن کی لڑائی کی صلاحیت کوختم کر دیا جائے۔

سائبر جنگ کے کمانڈروں کے لئے ضروری ہے کہ ان کے پاس لیڈرشپ کی خوبیاں اور صلاحیتیں بھی ہوں اور کام کے مطابق انفارمیشن ٹیکنالوجی، کمپیوٹر اور ڈیٹا سیکورٹی کا علم بھی ہو۔

سائبر جنگ میں بہت ضروری ہے کہ ہر وقت اور بہترین فیصلے کئے جائیں اور کمانڈر بہت جلد حالات کو سمجھ سکے اور موقع پر فیصلہ کر سکے، اس کو ٹیکنیکل چیزوں کی سمجھ ہونی چاہئے اور اس میں دوسروں کو سمجھانے کی صلاحیت ہونی چاہئے۔ وہ کمانڈر جو کہ ایکشن لینے میں پہل کر سکے۔اس کے لئے حالات کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنا آسان ہوگا۔

کچھ ترقی یافتہ ملکوں نے بہت پہلے ہی سائبر جنگ کے خطرات کو بھانپ لیا تھا اور سائبر کمانڈز تیار کر لی تھیں۔امریکہ نے نوّے کی دھائی میں یو ایس سائبر کمانڈ پر کام کرنا شروع کر یا تھا۔اس کمانڈر کے چند اہم کام مندرجہ ذیل ہیں۔ اس مطابق:

"USCYBERCOM plans, coordinates, integrates, synchronizes and conducts activities to direct the opertions and defense of specified Department of Defense information networks, and prepare to , and when directed , conduct full spectrum military dyber spae operations in orde rto enable actions in all domains, ensure US / Allied freedom of action in cyber space and deny the same to our adversaries."

امریکی برّی، بحری اور ہوائی فوج کی اپنی اپنی کمانڈز ہیں اور USCYBERCOM ان کاموں میں یگانگت پیدا کرتی ہے۔ 2014ء میں اس کمانڈ میں 60,000 لوگ کام کر رہے تھے۔اس کمانڈ کا ہیڈ کوارٹر امریکن نیشنل سیکورٹی ایجنسی کے ساتھ ہی واقع ہے تا کہ یہ دونوں آپس میں مشترکہ قسم کی پلاننگ کر سکیں۔اس ادارے میں ریاضی، کمپیوٹر سائنس اور انجینئرنگ کے پی ایچ ڈی کام کرتے ہیں۔سائبر کمانڈ تین سیکٹروں میں کام کرتی ہے۔ایک ملٹری کے کمپیوٹر نیٹ ورکس کے دفاع کے لئے ہے، دوسرا سائبر جنگ کے لئے اور تیسرا اہم انفراسٹرکچر کے دفاع کے لئے کام کرتا ہے۔

امریکی آرمی نے اپنے سائبر یونٹ تیار کر لئے ہیں۔ یہ انفنٹری کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔مگر انفنٹری کا کام

جنگ کے ذریعے دشمن کو تباہ کرنا ہے جب کہ سائبر فورسز کا کام سائبر حملے ہی ہوگا۔ پچھلے کئی سالوں سے یہ تنظیمیں سائبر جنگ کی مشقیں کر رہی ہیں۔ زیادہ تر مشقیں جنوبی کیلی فورنیا میں ہوتی ہیں۔

8۔ سائبر حملوں میں کمی کی حکمت عملی

سنگر اور فریڈ مین نے 2014ء میں سائبر حملوں سے نبٹنے کے لئے مندرجہ ذیل اصول روشناس کرائے تھے:

- ایسی صلاحیت پیدا کریں کہ ناسازگار حالات میں بھی کام کر سکیں۔
- جوابی کاروائی کی قوبڑھائیں تاکہ آپ خراب حالات میں کام کر سکیں اگر آپ کا سسٹم اثر انداز ہوا ہے تو اسے واپس صحیح حالتمیں جلدی سے جلدی لا سکیں۔
- ان تجربوں سے مستقبل کے لئے لائحہ عمل تیار کریں۔

سائبر حملوں کی صورت میں مندرجہ ذیل ایکشن لیں۔

- اہم انفارمیشن کو لاک ڈاؤن کریں
- باہر کے لئے جو انٹرنیٹ سروسز ہیں ان کو بند کریں
- وقار کے ساتھ ناکامی کے لئے خود کو تیار کریں (Organize to fail "gracefully")
- جوابی کاروائی کا مطلب یہ سمجھنا ہے کہ کسی سسٹم کے مختلف حصوں کا علم ہو اور سائبر حملوں کے بعد پھر ان کو یکجا کیا جا سکے۔

اس کا بہترین حل کام کرنے والوں کا ایسے خطرات کا مقابلہ کرنے کا روّیہ ہے لیکن یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ کسی بھی ادارے میں لوگ ہی ہوتے ہیں جو ان حالات کا مقابلہ کرتے ہیں اس لئے ان کی ٹریننگ اور تربیت بہت اہمیت کی حامل ہے۔

8.1۔ انٹرنیٹ پروٹوکول ورژن۔6 (IPV6)

یہ ورژن اس سے پہلے IPV4 کی جگہ لیتا ہے۔ یعنی اب یہ انٹرنیٹ کی زبان ہے۔ یہ دنیا کے صرف کمپیوٹر addresses کی کمی کے مسئلے کو ہی حل نہیں کرتا بلکہ اس میں زیادہ سیکورٹی کی خوبیاں موجود ہیں لیکن اس کو

استعمال میں لانا اداروں کی صوابدید پر ہے۔ یہ ورژن سامنے آنے کے باوجود سائیبر حملہ آور انٹرنیٹ کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مداخلت کر سکتے ہیں۔

8.2 فوجی ڈاکٹرائین(اصول)

خواہ فوجی ڈاکٹرائین جتنی بھی لچکدار اور مطابقت پذیر نظام کی حامل سائیبر اپنے سسٹم میں سائیبر حملہ آور اس کے انفراسٹرکچر پر حملہ آور ہوسکتے ہیں۔ Sun Tzu کا جنگی آرٹ یہ دونوں خوبیاں اپنے اندر رکھتا ہے لیکن اس میں سائیبر جنگ کے تمام خطرات سے عہدہ برآ ہونے کے تمام طریقے موجود نہیں ہیں۔ نیچے دی ہوئی فگر یہ واضح کرتی ہیں کہ سائیبر حملوں میں کمی کرنے والے طریقے کیسے ان کے اثرات اور خطرات کو کم کر سکتے ہیں۔

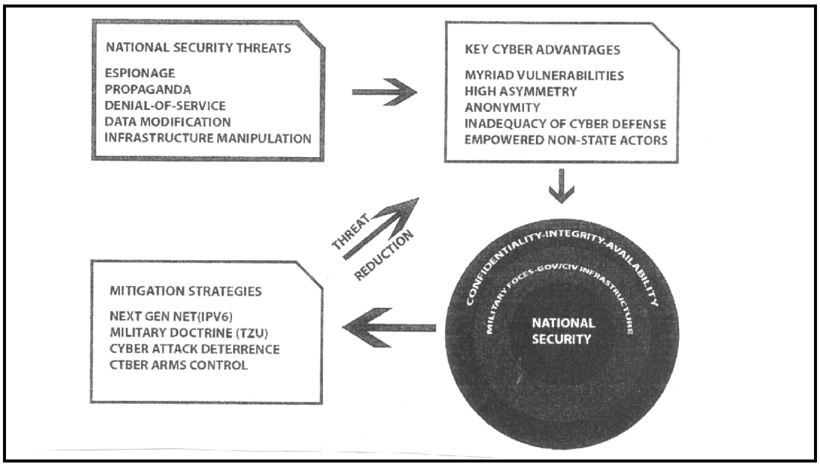

source: Geers (2011)

8.3۔ کمپیوٹر ایمرجنسی ٹیمز (CERTs)

یہ تنظیمیں قومی سطح پر ایمرجینسی سے نپٹنے اور سائیبر خطرات سے آگاہ کرنے اور ان کے اثرات کم کرنے کے لئے بہت کار آمد ثابت ہوسکتی ہیں۔ یہ قومی ٹیمیں اداروں کی ایسی ہی ٹیموں کے ساتھ مل کر مؤثر کام کر سکتی ہیں۔ سائیبر حملوں کی صورت میں اس ٹیم سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ سائیبر حملوں کے مقابلے کے لئے گورنمنٹ اور

پرائیویٹ ادارے آپس میں یگانگت پیدا کریں۔اور وہ ادارے جو انٹرنیٹ سروس مہیا کرتے ہیں وہ بھی پوری طرح سے ساتھ شامل ہوں۔

8.4 تیاری کے ستون

آسٹریلین کمپیوٹر سوسائٹی 2016ء کے مطابق سائبر حملہ کے دفاع کے مندرہ ذیل ستون ہیں:

8.4.1۔ تعلیم اور آگاہی

سائبر سیکورٹی کی تعلیم سکول سے شروع ہونی چاہیے۔سائبر سیکورٹی کے ماہرین تیار کرنے کا طریقہ کار بہت لمبا ہے خصوصاً کر جب ٹیکنالوجی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے اور سائبر سپیس پھیلتی جا رہی ہے۔اس وقت تک پاکستان میں ان خطرات سے آگاہی کا فقدان ہے۔اس کے لئے حکومت کو پہل کرنی چاہئے اور ایک مکمل پروگرام شروع کرنا چاہئے۔

8.4.2۔ پلاننگ اور تیاری

سائبر خطرات کے متعلق مکمل پتہ ہونا چاہئے اور ایک اچھا management سسٹم تیار ہونا چاہئے۔تمام سٹیک ہولڈرز کو اپنے سٹینڈنگ آپریٹنگ پروسیجر (SOPs) بنانے چاہئیں۔

8.4.3 گرفت اور بحالی Detection and Recovery

حساس اور اہم تنصیبات کو ان خطرات کے مقابلے کے لئے، دخل اندازی کو روکنے اور جوابی کاروائی کی صلاحیت ہونی چاہئے۔مداخلت کا بروقت پتہ چلانا اور پھر اس کا سدباب کرنے کے لئے CERTs کی تربیت کرنی چاہئے تاکہ وہ ہر خطرے کے مقابلے کے لئے ہمیشہ تیار رہیں۔

8.4.4 Access Control Network Security

سسٹم کی بناوٹ ایسی ہونی چاہئے اور اس سیکورٹی کی صلاحیت ایسی ہونی چاہئے کہ وہ سائبر حملوں کی صورت میں دستیاب رہے۔اس میں وائرلیس دخل اندازی سے بچنے کی صلاحیت ہونی چاہئے۔اس میں ضروری کوڈ وغیرہ ہونی چاہئیں جن کو توڑنا مشکل ہو۔اس کے لئے ایک مؤثر SOPs موجود ہونی چاہئیں۔

9۔ Sun Tzu's جنگ کا آرٹ اور سائبیر سیکورٹی

Sun Tzu کا پانچویں صدی کا جنگ کا آرٹ اس قدر لچکدار ہے کہ وہ آج بھی سائبیر حملوں کی صورت میں استعمال ہوسکتا ہے۔میڈسن (2017)اس کے مندرجہ ذیل اصول بیان کرتا ہے

9.1 دشمن کو سمجھیں اوراپنے آپ کو سمجھیں

یہ عسکری قیادت کا ایک اہم اصول ہے۔امن کے زمانے میں بھی دشمن کی فوجی تیاریوں اور جنگی حکمت عملی کے متعلق معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ اپنی طاقتوں اور کمزوریوں کا مسلسل جائزہ لیا جاتا ہے۔تاکہ دشمن کے کسی بھی خطرے سے نمٹا جا سکے۔سائبیر سیکورٹی میں یہ تیاری بھی کی جاتی ہے کہ ہیکرز کیسے اپنا کام کریں گے۔ان کے پاس کیا ذرائع ہیں۔اوران کی قابلیت کیا ہے؟ کیا اپنا سسٹم محفوظ ہے؟ کیا ہمارے پاس تربیت یافتہ لوگ موجود ہیں اور یہ کہ ہم اپنی کمزوریوں کو کیسے دور کرسکتے ہیں۔

9.2 تمام جنگ دھوکہ دہی پر منحصر ہوتی ہے

جنگی حکمت عملی اور جنگی چالوں میں دھوکہ دہی ایک مؤثر جنگی حربہ ہے۔دھوکہ دہی سے دشمن پرفوقیت حاصل کی جاتی ہے کیونکہ دشمن کو یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ حملہ کدھر سے ہو رہا ہے۔سائبیر حملہ آور بھی دھوکہ دہی ہی سے وار کرتے ہیں۔حساس انفارمیشن حاصل کرنے کے لئے ایک ہیکر اپنے آپ کوادارے کا سربراہ بھی ظاہر کرتا ہے۔ایسا سٹاف جوتربیت یافتہ نہیں ہوتا یا ہیکر کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھتا وہ اس کے دھوکے میں آجاتا ہےاور حساس انفارمیشن اورخفیہ معلومات ظاہر کرسکتا ہے جس میں ہیکر اپنے مقاصد حاصل کرسکتے ہیں۔جنگ کے آرٹ میں مداخلت کی دھوکہ دہی ایک نیا جنگی حربہ ہے۔Sun Tzu نے کہا تھا کہ جب تم کمزور ہوتو اپنے آپ کو طاقتور ظاہر کرواور جب تم طاقتور ہوتو اپنے آپ کو کمزور ظاہر کرو۔website اگر کمزور ہوتو اسے طاقتور ظاہر کیا جاسکتا ہے۔

9.3 دشمن پر وہاں ضرب لگاؤ جہاں وہ کمزور ہے اورایسی جگہ سے حملہ کرو جہاں دشمن توقع نہ کررہا ہو

سائبیر حملہ آور اسی اصول پرعمل کرتے ہیں غیر تربیت یافتہ عملہ ہی بڑی کمزوری ہوگا۔حملہ آور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے سسٹم میں نئے راستے سے داخل ہوں گے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ سٹاف کوسائبیر سیکورٹی میں اچھی تربیت دی جائے۔ادارے کے پاس تربیت یافتہ ماہرین ہونے چاہئیں۔ادارے کے اندراور دوسرے اداروں سے مسلسل

رابطہ ہونا چاہئے اور جب کوئی سائبر حملہ ہو تو اس کا مکمل طور پر جائزہ لے کر مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرنا چاہئے اور اس سے بچنے کے لئے مشقیں کرنی چاہئیں۔

10۔ سائبر سیکورٹی اور سائبر جنگ میں پاکستان کہاں کھڑا ہے

انٹرنیٹ کا غیر قانونی استعمال کوئی فرد کرے یا سروس مہیا کرنے والا کوئی ادارہ اس کی روک تھام کے لئے پارلیمنٹ نے 22 اگست 2016ء کو الیکٹرانک کرائمز ایکٹ کی شکل میں ایک قانون منظور کیا تھا۔ یہ قانون سائبر دہشت گردی، تفتیش کرنے اور غیر قانونی ای میلز بھیجنے والوں کے سدِ باب کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس کا اہم پہلو یہ تھا کہ اس میں سائبر جرائم کو روکنے کے لئے SERTs قائم کرنے کے متعلق مندرجہ ذیل ہدایات ہیں:

- فیڈرل گورنمنٹ کمپیوٹر ایمرجینسی، رسپانس ٹیم (SERT) بنا سکتی ہے جو کہ کسی خطرے یا سائبر حملے کے صورت میں جو کہ حساس انفرمیشن سسٹم یا انفراسٹرکچر پر ہو یا جو باقی ڈیٹا یا انفارمیشن سسٹمز پر پھیل سکے ان کا سدباب کر سکے۔
- وہ SERTs جو اس قانون کے مطابق بنائی جائیں وہ ٹیکنیکل ماہرین اور انٹیلی جنس اداروں کے افسروں پر مشتمل ہو سکتی ہیں۔
- ایسی SERTs کسی بھی سائبر حملے یا خطرے سے نمٹنے کے لئے حرکت میں آئے گی مگر ایسا کرتے ہوئے یہ یقین کرے گی کہ اداروں کے کام میں کوئی رکاوٹ یا تنگی نہ آئے۔

اوپر والے ایکٹ پر کام کرتے ہوئے پاکستان ٹیلی کام اتھارٹی (PTA) نے ایک مکمل قسم کی SERT تشکیل دی تھی جو کہ مندرجہ ذیل سروسز مہیا کرے گی:

- سائبر حملہ ہونے کی صورت میں حرکت میں آنا
- سائبر حملوں سے بچاؤ کے انتظامات کرنا
- سائبر سیکورٹی کی کوالٹی کو بہتر بنانا اور اس میں دوسرے اداروں کے سسٹم کو بہتر بنانے کی تجاویز دینا اور اس کام میں شامل ہونا۔
- PTA کی SERT کی ذمہ داریوں میں یہ بھی شامل ہے کہ ایسے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا

اقدام کرنے چاہئیں۔ وہ ادارے جنہوں نے سروسز مہیا کرنے کے لائسنس لئے ہوئے ہیں ان کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ حساس انفارمیشن انفراسٹرکچر کونسے ہیں جن کی حفاظت ضروری ہے۔ لائسنس یافتہ ادارے اپنی SERTs بھی قائم کریں گے اور ضرورت کے وقت یہ SERTs حرکت میں آئیں گی۔ SERTs سائیبر حملوں کے بچاؤ کے طریقے بھی وضع کریں گی۔ صرف لائسنس یافتہ ادارے ہی نہیں بلکہ باقی ادارے بھی سائیبر حملوں سے بچاؤ اوران کا مقابلہ کرنے کے لئے اقدامات کریں گے۔

10.1 PTA کی ذمہ داریاں

PTA کی SERT ایک منظم ٹیم ہوگی جس کا اپنا بجٹ ہوگا اور وہ لائسنس یافتہ تنظیموں کے ساتھ رابطے میں رہے گی۔ اور اپنے آپ کو ہر قسم کے سائیبر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرے گی۔ دوسرے اداروں کے ساتھ بھی رابطے رکھے گی۔ یہ ٹیم مندرجہ ذیل سروسز مہیا کرے گی:

- سائیبر واقعات کا تجزیہ
- ان واقعات میں مدد دینا
- ان واقعات کے متعلق رابطے رکھنا
- گلوبل SERTs کے ساتھ رابطے رکھنا
- تعلیمی اداروں سے رابطے رکھنا
- کمزور اداروں کی مدد کرنا اوران سے رابطے رکھنا۔
- الرٹ اور وارننگ دینا۔
- معلومات دینا
- سائیبر سیکورٹی کے متعلق معلومات دینا۔
- اداروں کا باخبر رہنا اور تعلیم اور ٹریننگ مہیا کرنا۔

PTA کے پلان میں SERT کے لئے کیا ذرائع ہونے چاہئیں۔ انفرادی قوت کی ضرورت، equipment اور انفراسٹرکچر کے متعلق ہدایات ہیں۔ اس کی ایک مکمل تنظیم جس میں انفارمیشن سیکورٹی اپریشن سنٹر کا قیام شامل ہے۔ PTA کا پلان تو ایک اچھا پلان ہے جس میں بڑھتے ہوئے سائیبر خطرات اور حملوں کے متعلق ہدایات ہیں۔ اس

پلان کو بہتر بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ دنیا کے حالات کے مطابق اور بھی بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ اس پلان پر کہاں تک عمل ہوا ہے۔ کیا وہ سنٹرز جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ موجود بھی ہیں کہ نہیں۔ کیا PTA سے لائسنس یافتہ اداروں نے اپنی اپنی SERTs بنا رکھی ہیں یا نہیں۔ کیا سائیبر سیکورٹی کی ٹریننگ کے انتظامات بھی موجود ہیں یا نہیں۔ ظاہری طور پر ان سب اقدامات کا موجود ہونا مشکوک نظر آتا ہے۔

10.2 پاکستان ملٹری سائیبر کمانڈ

پاکستان ملٹری مؤثر کمیونی کیشن سے ہی اپنے فنکشن سرانجام دے سکتی ہے۔ ہمارا مشرقی پڑوسی ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں سنجیدہ نہیں ہے۔ اس لئے پاکستانی افواج کو سائیبر حملوں کا خطرہ عین ممکن ہے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ مستقبل کی جنگ سائیبر ہی ہوگی اور جو ملک اس میں طاقتور ہوگا وہ میدان جنگ میں جائے بغیر ہی جیت جائے گا آئندہ کی جنگ میں مندرجہ ذیل خطرات لاحق ہوسکتے ہیں۔:

- کمیونی کیشن سسٹم اور کمپیوٹرز کام نہیں کریں گے
- میزائل یا تو ناکارہ ہو جائیں گی یا اپنے ہی ملک میں گریں گے
- تمام انفارمیشن اور ڈیٹا ختم ہو جائے گا
- سب سے خطرناک اثر یہ ہوگا کہ ملٹری کمانڈ اور کنٹرول سسٹم بے کار ہو جائے گا۔ مختلف یونٹ اپنے ہیڈ کوارٹرز سے کٹ جائیں گے
- سائیبر سسٹم کام نہیں کرے گا
- ایٹمی کنٹرول سسٹم ناکارہ ہو جائے گا

امید ہے کہ پاکستان کی افواج نے اس کی تیاری کی ہوگی اور سائیبر کمانڈز بنائی گئی ہوں گی لیکن قوم کو اس سے آگاہ کرنا ضروری ہے اس کو خفیہ نہ رکھا جائے اس سے قوم کا حوصلہ بلند ہوگا۔

11۔ مستقبل کا لائحہ عمل (The Way Forward)

سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ ایک بین الاقوامی قانون ہو جو انٹرنیٹ کے استعمال کو کنٹرول کر سکے تاکہ کوئی بھی اسے سائیبر خطرات اور سائیبر حملوں کے لئے استعمال کر سکے۔ اس پر عمل لازم قرار دیا جائے۔ یہ قانون کیمیکل ہتھیاروں کے کنونشن (CWC 1997) کی طرز پر بن سکتا ہے۔ اقوام متحدہ کی طرف سے بین الاقوامی ٹیلی کمیونیکیشن یونین

کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ انٹرنیٹ کے استعمال کو ریگولیٹ کر سکے۔اس سے پہلے اس قسم کی کوششیں طاقتور ملکوں نے کامیاب نہیں ہونے دیں ایسے ممالک میں امریکہ سرفہرست ہے۔اس کے علاوہ انٹرنیٹ کی ساخت کی وجہ سے اس کو کنٹرول کرنا بہت دشوار ہے۔لیکن بین الاقوامی ادارہ ہوتو کسی حدتک موزوں قوانین بنائے جا سکتے ہیں اور شروعات ہوسکتی ہے۔

انٹرنیٹ کوزیادہ محفوظ بنانے کی اشد ضرورت ہے۔گو IPv6 پہلے کے پروٹوکول IPv4 سے بہتر ہے لیکن اب بھی یہ ہیکنگ اورسائیبر حملوں سے نپٹنے کے لئے کارگر نہیں ہے۔ٹیلی کمیونیکیشن ٹیکنالوجی بہت تیز رفتاری سے ترقی کر رہی ہے اس لئے اس میں زیادہ سیکورٹی لانا بہت ضروری ہے۔ملکوں کے لئے firewalls بنانا کوئی زیادہ موزوں قدم نہیں ہے کیونکہ اس سے اپنے ملک کی باہر کی دنیا تک پہنچ مشکل ہو جاتی ہے۔ٹیکنالوجی میں ترقی کمپیوٹر انفراسٹرکچر کوزیادہ محفوظ بنانے میں مدد دے سکتی ہے اوراس قابل بنا سکتی ہے کہ سائیبر حملوں کے بعد وہ جلد اپنی پہلی پوزیشن پر واپس آجائے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنا سسٹم دخل اندازی کی روک تھام کے قابل ہو۔گورنمنٹ اور پرائیویٹ اداروں کے درمیان مسلسل رابطے بہت ضروری ہیں۔اوران سب کومشترکہ لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا۔

اوپر والے اقدام کے علاوہ cloud computing کا استعمال انفرادی طور پر اوراداروں کی سطح تک بہت فائدہ مند ہوگا۔اس طریقہ کار کا مطلب یہ ہے کہ اپنا ڈیٹا وغیرہ اپنے نہیں بلکہ کسی اور کے سسٹم میں رکھا جائے۔ یہاں تک کہ بعض ملکوں کی افواج بھی یہ سہولت استعمال کر رہی ہیں۔ یہ سہولت میسر کرنے والے ادارے سائیبر سیکورٹی کے متعلق خود اقدام اٹھاتے ہیں۔ عام اداروں اور باقی افراد کے لئے اس قسم کی سہولیات پیدا کرنا مشکل ہے۔مگر Cloud Computing دینے والے ادارے سائبر سیکورٹی کے ماہرین ہیں اور وہ ان کی تربیت کا بندوبست کرتے ہیں۔

سائبر حملوں اور سائیبر جنگ کے بادل ہمارے اوپر منڈلاتے رہیں گے۔اس کا سامنا کرنے کے لئے مختلف ممالک اپنے سائیبر سیکورٹی کے ماہرین تیار کرتے ہیں۔ یہ صرف قومی سطح پر ہی ممکن ہے۔کالجوں اور یونیورسٹیوں کو سائیبر لیڈر اور سائیبر مینجر تیار کرنے ہوں گے۔اس کے لئے پاکستان کی گورنمنٹ۔ پرائیویٹ اداروں اور افواج کو مل کر کام کرنا ہوگا۔

12۔ پاکستان کے لئے پالیسی سفارشات

- مکمل اورمؤثر قانون سازی کی ضرورت ہے جوافراداورمختلف ممالک کی طرف سے سائیبر حملوں اور سائیبر جنگ کوروکنے کے لئے ایک لائحہ عمل مہیا کرسکے۔گواس وقت سائیبر جرائم کے متعلق قانون موجود ہےمگر یہ دشمن ملکوں کی ایسی کاروائیوں کا مقابلہ کرنے کے لئےنہیں ہے۔
- کچھ عرصہ پہلے ایک سائیبر پالیسی بنائی گئی تھی امید ہے کہ اس پرعمل ہوگا۔اس پالیسی کے کیا مقاصد ہیں اوراداروں کی کیا ذمہ داریاں ہوں گی۔اس کے متعلق تفصیلات سامنے آنی چاہئیں۔
- دفاعی اداروں،سول تنظیموں اور باقی سٹیک ہولڈرز کی مشترکہ ورک فورس تشکیل دی جائے۔اس وقت ان اداروں کے درمیان رابطوں کا فقدان ہےاس لئے کوئی مؤثر سائیبر سیکورٹی فورس سامنےنہیں آئی۔نیشنل سیکورٹی ڈویژن کواس کی مکمل ذمہ داری لینی چاہئیں۔
- پاکستان ٹیلی کام سیکٹر کا عمل درآمد پلان اور SERTs الیکٹرونک کرائم ایکٹ کا ہی حصہ ہونا چاہئے
- ملٹری کی سائیبر کمانڈ تشکیل دی جائے۔اس کے لئے کسی ترقی یافتہ ملکوں کے ماڈل کواختیار کیا جاسکتا ہے۔
- یونیورسٹیوں کوسائیبر سیکورٹی لیڈرز اور مینیجرز کے لئے پروگرام شروع کرنے چاہئیں اور مستقبل کے ماہرین کوتربیت دینی چاہئے۔اس کے لئے بھی ترقی یافتہ ملکوں کے پروگرام اپنانے چاہئیں۔
- PTA جن اداروں کے سیکورٹی آڈٹ کرے ان کوان سب کے ساتھ شیئر کرنا چاہئے جن کا تعلق انفارمیشن ٹیکنالوجی سے ہے
- آئی ٹی اداروں کواپنے سسٹم ایسے بنانے چاہئیں کہ ان میں مداخلت نہ ہوسکے۔
- اداروں کے درمیان اوراداروں کے اندرسائیبر انٹیلی جنس شیئر ہونی چاہئے تاکہ آنے والے سائیبر خطرات کے متعلق آگاہی رہے۔
- سائیبر سیکورٹی اورسائیبر جنگ کے لئے مؤثر بین الاقوامی قوانین نہائت ضروری ہیں۔ان قوانین کولاگو کرنے کی ذمہ داری آئی ٹی یوکودینی چاہئے۔

13۔ لُبِ لباب (Conclusion)

سائبر حملوں کو ناکام بنانے کے لئے مؤثر صلاحیت حاصل کرنا وقت کا تقاضہ ہے اور یہ صلاحیت جلد سے جلد حاصل کرنی چاہیئے۔ انٹرنیٹ کے اوپر انحصار سائبر حملہ آوروں کے لئے آسانیاں پیدا کرتا ہے اور ایسے حملہ آور Anonymity اور Asymmetry سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے وار کرتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم حملہ آوروں کے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔ مؤثر SOPs اور SERTs ایسے حالات میں کارگر ثابت ہو سکتی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایسے خطرات اور حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے دفاعی افواج سول تنظیمیں اور انٹرنیٹ سروس مہیا کرنے والے اداروں کو مل کر کام کرنا ہوگا۔ یہ یاد رکھا جائے کہ اگر ملک کی آبادی کا اعتماد حکومت یا فوج سے اٹھ جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دشمن کامیاب ہو گیا کیونکہ انفارمیشن کی جنگ بغیر لڑائی کے جیتی جا سکتی ہے۔ یہ طریقہ مسلّح جارحیت سے ہزاروں گنا زیادہ بہتر ہے۔ پاکستانی افواج کو سائبر کمانز تیار کرنی چاہئیں اور قوم کو اس سے آگاہ کرنا چاہیئے تاکہ افواج پر قوم کا اعتماد اور مضبوط ہو۔

(The Author is Senior Advisor, SDPI)

چین کے قومی سطح پر بنائے گئے مقامی نمائشی زون (NIIDs) کے دورے کے لیے سائنسدانوں، محققین اور میڈیا (سائنسز) کے وفد میں ایس ڈی پی آئی کی شمولیت۔

چینی سفارتخانے کے تعلقات عامہ کی طرف سے دعوت پر پاکستانی سائنسدانوں، محققین اور میڈیا (سائنسز) کے وفد نے چین کے قومی سطح پر بنائے گئے نمائشی زونز (NIIDs) اور انٹرنیشنل ٹیکنالوجی ٹرانسفر سینٹر بیجنگ کا 26 نومبر سے 6 دسمبر 2018ء تک دورہ کیا۔ وفد اسلام آباد سے 25 نومبر کو روانہ ہوا اور 7 دسمبر کو واپس پہنچا۔ وفد میں وفاقی اور صوبائی دارالحکومت پشاور، لاہور اور کراچی سے یونیورسٹیوں، ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ (R&D) انسٹی ٹیوشنز اور میڈیا (سائنسز) کے نمائندے شامل تھے۔ وفد میں پالیسی ادارہ برائے پائیدار ترقی (SDPI) اسلام آباد کی نمائندگی سینئر ایڈوائزر، پائیدار صنعتی ترقی اور کیمیکلز، ڈاکٹر محمود اے خواجہ نے کی۔ ایس ڈی پی آئی اسلام آباد میں تفصیلی مشاورت اور 22 نومبر کو دورے کے حوالے سے SDPI کی تجویز پر وفد کی ایک بریفنگ ہوئی۔ شرکاء کو بتایا گیا کہ دورے کا مقصد پاکستان اور چین کے تعلقات کو مزید مضبوط بنانا اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبہ میں دوطرفہ تعاون کو فروغ دینا ہے، ہماری طرف سے وقت کی کمی کے باعث دورہ جلدی میں ہوا تاہم چینی سفارتخانے کا کردار قابل تعریف ہے۔ ٹیکنالوجی ٹائمز (مقامی میزبان) کے اسٹاف کے تعاون اور وفد میں شامل نمائندگان کے بروقت ردعمل سے دورے کو حتمی شکل دینے میں مدد ملی۔ تاہم اگر وفد کو دورے سے قبل نمائشی زونز NIIDZs کے ٹیکنالوجی کے شعبوں کے حوالے سے بریفنگ مل جاتی تو یہ زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتا۔ وقت کی کمی کے باعث انٹرنیٹ پر بھی اس حوالے سے معلومات تک رسائی ممکن نہ تھی کیونکہ یہ معلومات زیادہ تر چینی زبان میں تھیں۔ چین میں قومی سطح پر مقامی نمائشی زونز (NIIDs)) کے جن پانچ زون کا دورہ کیا گیا ان میں (جنان) Jinan، (جیانگزو) Jiangshu، (ہانگزھو) Hangzhou، (ننگبو) Ningbo اور (ووہان) Wuhan شامل تھے۔ دورے میں ٹیکنالوجی اور

ٹیکنالوجی کی منتقلی کے بارے میں معلومات سے آ گاہی،اداروں کا دورہ،میونسپل سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کمیشن / بیورو آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (ایس اینڈ ٹی) انوویشن، کے ارکان سے گفتگو وشنید کی گئی اس کے علاوہ Qilusoft Park Development center, Biobase China, Inspur and Senfeng; Nanjing Institute of Advanced Laser Technology; H3C Technologies, HHTZ, Z-S-T-E-C; Ningbo Institute of Information Technology Application (ITA); HBSTEC & HBITTC and Torch High-Tech Industry Development Center, MO/S&T, Beijing. کے دورے ماہرین اور حکام سے بھی ملاقاتیں ہوئیں ۔نمائشی زونز NIIDZs/institutions میں چینی حکام سے معلومات کا تبادلہ اور بحث ہمارے ملک میں سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (ایس اینڈ ٹی) کی تیزی سے ترقی کے حوالے سے بہت مفید،علمی ثابت ہوئی اسی طرح سائنس پارکس کو بطور ٹیکنالوجی بزنس سینٹرز کے طور پر استعمال کرنے کی سوچ،عملدرآمد اور طریقہ کار، سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے لیے ٹیکنالوجی ٹرانسفر ماڈل ایجنسیز کے ذریعہ تعاون حاصل کرنا،ٹیکنالوجی بزنس انکوبیٹرز، پائلٹ پارکس برائے ٹیکنالوجی (168 پارکس پہلے ہی چین کے مرکزی،ساحلی اور روائتی صنعتی شہروں اور ترقی پذیر علاقوں میں موجود ہیں)انوویٹیو فنڈ،مقامی ترقی کے لیے صنعتی ترقی،کاروباری اداروں کی تشکیل کا پلیٹ فارم،میچ انڈسٹری میکنگ،صنعتی سربراہی اجلاس Summit ،انٹرنیٹ ٹاؤن شپ،اینٹرپنیور شپس سیلون،اسٹریٹجک اینٹرپنیور پارٹنرز کلب،اینڈ، یونیورسٹیز سائنس پروگرامز (صنعتی اور تعلیمی اداروں میں تعاون کے ذریعہ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں نوے فیصد کامیابیاں) کے حکام اور ماہرین سے بھی ملاقاتیں اور معلومات کا تبادلہ بہت مفید ثابت ہوا۔چین کے نمائشی مقامی زونز اور ٹارچ ہائی ٹیک آئی ڈی سینٹر کا دورہ اور تبادلہ خیال کیا گیا۔ایس ڈی پی آئی کے ڈاکٹر خواجہ نے اس حوالے سے کچھ نکات اٹھائے جو کہ ذیل میں دیئے گئے ہیں۔

- روایات سے ہٹ کر تبدیلیوں کو قبول کرنے کے محرکات وترغیبات
- صنعت،ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ (آر اینڈ ڈی) یا یونیورسٹیز سے ترغیب اور تعاون کا ملنا
- ٹریڈ مارک کے لیے درخواست دینا/ منظوری، اندرونی / چین یا بیرونی / انٹرنیشنل
- صنعتی سربراہ اجلاس کرانے کا طریقہ کار / اہم رہنمائی نکات
- سرمایہ کاری کے لیے حکمت عملی
- ماحولیاتی سمیت مقامی اور انٹرنیشنل معیارت اور عملدرآمد

- نجی اور سرکاری آر اینڈ ڈی اداروں کے درمیان کام کرنے کے طریقہ کار میں فرق
- یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور قابل محققین کو NIIDs تحقیق کے کاموں کے لیے راغب کرنا
- کاروبار کے پیرامیٹرز تجرباتی رپیشنگوئی کے ساتھ بقا کی تصدیق
- چین کے ساحلی اور ترقی پذیر علاقوں میں کاروبار کی بقا کے لیے ترجیحی تحقیقی پارک

2015 میں اقوام متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام (UNEP) کے مصنوعات میں کیمیائی استعمال کے حوالے سے اسٹیرنگ گروپ کے اجلاس میں شرکت کے لیے آخری بار چین کا دورہ کیا تھا جس کے بعد میں اب چوتھی بار چین گیا تو وہاں کی زبردست ترقی اور چین کی سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (ایس اینڈ ٹی) کے شعبہ میں کامیابیوں کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ چین میں سیاست اور سماجی ماحول دو الگ چیزیں ہیں اور یہ ہمارے ملک کے لیے بھی ایک مثال ہو سکتی ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ چین نے کس طرح ریسرچ اینڈ ڈیویلپمنٹ / سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (آر اینڈ ڈی/ایس اینڈ ٹی) کے ذریعہ تیزی سے ترقی کی ہے۔ یہ انتہائی شاندار بات ہے کہ جس انداز میں چین نے باصلاحیت افراد کو تلاش کیا اور ریسرچ اینڈ ڈیویلپمنٹ / سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (ایس اینڈ ٹی میں آر اینڈ ڈی) اور سرکاری و نجی شعبوں میں افرادی قوت کی فراہمی کو یقینی بنایا جس سے تیزی سے معیشت نے ترقی کی۔ اس عمل سے وہاں کی عوام کا معیار زندگی بہتر ہوا اور ملک پائیدار ترقی کی طرف رواں دواں ہے۔ چین ریسرچ اینڈ ڈیویلپمنٹ / سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (آر اینڈ ڈی/ایس اینڈ ٹی) کے شعبہ میں تعاون کے حوالے سے آزاد پالیسی پر گامزن ہے اور چین کے اندر اور باہر دیگر ممالک میں اس حوالے سے تعاون کے لیے بھی تیار ہے چین ان شعبہ جات میں انفرادی محقق اور ادارہ جاتی سطح پر بھی تعاون کو فروغ دینا اور حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ نوجوان نسل خاص طور پر جدیدیت اور مال کی تیاری کے شعبہ جات میں منفرد تحقیق سے تبدیلی لا سکتی ہے۔ معلومات کے تبادلے، مشاہدے اور دورے کے دوران ملاقاتوں میں بحث و تمحیص کی بنیاد پر SDPI کی طرف سے کچھ سفارشات پیش کی جا رہی ہیں جن کے ذریعہ دورے کے مفید نتائج اور فالو آپ دورے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے میں مدد اور راہنمائی مل سکتی ہے۔

- جن اداروں کا دورہ کرنا مقصود ہو ان کے حوالے سے دورے سے قبل معلومات کی فراہمی
- تجارت اور صنعت سے نمائندوں کی شرکت
- چین کے نمائشی زونز کے دورے کے دوران چینی زبان کے ساتھ ساتھ انگلش زبان میں تعارفی ویڈیوز کا اجرا اور سوالات اور جوابات کو سمجھنے کے لیے محقق کے ساتھ ترجمان کی سہولت کی فراہمی

- دونوں ممالک کے سائنسدانوں، محققین اور ریسرچ اینڈ ڈیویلپمنٹ/ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (آر اینڈ ڈی /ایس اینڈ ٹی)اداروں کے پتہ، رابطہ نمبر پر مشتمل معلوماتی ڈائریکٹری ہونی چاہئے جو چینی زبان کے ساتھ ساتھ انگلش اور اردو میں بھی ہو
- جاری دورے کے لیے سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (ایس اینڈ ٹی) کے سرکاری محکمے اور ایجنسی کا نامزد نمائندہ ہونا چاہئے
- چین/ سفارتخانے کے شعبہ تعلقات عامہ اور پاکستان کی وزارت سائنس وٹیکنالوجی کے ساتھ مل کر ریسرچ اینڈ ڈیویلپمنٹ/ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (آر اینڈ ڈی/ایس اینڈ ٹی) کے لیے متعلقہ مخصوص (Focal) نمائندہ سے رابطہ کرنا
- چین کے نمائشی مراکز کے دورے کے ساتھ ساتھ چین کی متعلقہ یونیورسٹیوں کے دورے کو بھی شامل کیا جائے تاکہ چین میں صنعت اور علمی اداروں کے تعاون کے حوالے سے زیادہ بہتر انداز میں سمجھ بوجھ اور معلومات حاصل ہوسکیں
- پاکستان اور چین کی سائنس وٹیکنالوجی کی وزارت اور وزارت ماحولیات کے درمیان ریسرچ اینڈ ڈیویلپمنٹ / سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (آر اینڈ ڈی/ایس اینڈ ٹی) کے شعبہ میں رابطوں کو مزید مربوط بنایا جائے
- پاکستان اور چین میں ہونے والی ورکشاپ، کانفرنسز اور صنعتی سربراہ کانفرنسوں میں محققین کی شرکت، دعوت اور معلومات کی فراہمی
- چین کے مراکز میں پاکستان میں گریجویشن کرنے والوں کو انٹرنشپ کے مواقع فراہم کرنا
- دونوں ممالک میں کامیاب منصوبوں (Projects) کے حوالے سے نمائش کا اہتمام کرنا
- پاکستان کے سائنسدانوں، محققین اور میڈیا کے افراد کے ساتھ اپنے متعلقہ اداروں، متعلقہ ریسرچ اینڈ ڈیویلپمنٹ/ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (آر اینڈ ڈی/ایس اینڈ ٹی)/ تعلیمی فورمز اور سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (ایس اینڈ ٹی کے) ہفت روزہ میگزین/ ٹیکنالوجی ٹائمز/ قومی اخبارات کے ذریعے دورے کے حوالے سے تجربات، مشاہدات اور معلومات کا بڑھانا
- پاکستان کے وفد کے دورے میں اٹھائے گئے سوالات وجوابات و بحث مباحثے اور دیگر سرگرمیوں کی

چین کے قومی سطح پر بنائے گئے مقامی نمائشی زون

تفصیلات، سائنس اور ٹیکنالوجی / ریسرچ اینڈ ڈیویلپمنٹ / چین کے تعلیمی ادارے، ویب سائٹس (نمائشی مراکز میونسپل ٹلیٹز، سائنس اور ٹیکنالوجی کمیشن، بیورو آف سائنس وٹیکنالوجی، چین کی سائنسز و دیگر اکیڈمیز) کی معرفت آگاہی

پاکستان اور چین کی دوستی کی ایک طویل تاریخ ہے مگر سائنس وٹیکنالوجی / ریسرچ اینڈ ڈیویلپمنٹ میں تعاون کا سلسلہ زیادہ طویل نہیں۔ دونوں ممالک کے عوام اور پائیدار ترقی کے لیے اس تعاون کو زیادہ سے زیادہ آگے بڑھانے کی ضرورت ہے

ڈاکٹر محمود اے خواجہ، سینئر ایڈوائزر برائے پائیدار صنعتی ترقی اور کیمیکلز، پالیسی ادارہ برائے پائیدار ترقی اسلام آباد۔
Tel: 009251 2278134 & 36; e-mail: khwaja@sdpi.org; m.a.khwaja@gmail.com;
Web:www.sdpi.org; www.sdpi.tv

شنگھائی میں جنوبی اشیاء اور چین کے موضوع پر کانفرنس

شنگھائی میں 25-24 نومبر 2018ء کو ''چین اور جنوبی ایشیاء'' کے موضوع پر دو روزہ بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں جنوبی ایشیائی ممالک پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، سری لنکا اور دیگر جنوبی ایشیائی ممالک کے ساتھ ساتھ یورپ اور امریکہ کے مندوبین نے بھی شرکت کی۔ پاکستانی مندوبین میں ایس ڈی پی آئی سے احمد سلیم اور انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کی طرف سے ڈاکٹر حمیرا اشفاق نے شرکت کی۔ کانفرنس انسٹی ٹیوٹ آف گلوبل سٹڈیز، شنگھائی یونیورسٹی کے پلیٹ فارم سے منعقد ہوئی۔ پاکستان سے پنجاب یونیورسٹی، نسٹ (NUST) اور دیگر یونیورسٹیوں سے پندرہ مندوبین کے علاوہ ایس ڈی پی آئی کے بورڈ آف گورنرز کے سابق چیئرمین ڈاکٹر شفقت سعید نے بھی شرکت کی۔ احمد سلیم نے چین کی یونیورسٹیوں میں پاکستان کے موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے والے طلبا و طالبات کے لئے سورس مٹیریل کے موضوع پر اظہار خیال کیا اور بتایا کہ پاک۔چین تعلقات کے حوالے سے سماجی علوم، تاریخ، ادب اور اقتصادیات کے شعبوں میں چینی یونیورسٹیوں کے طلباء و طالبات کی کیسے مدد کی جا سکتی ہے۔ اس موضوع پر ساؤتھ ایشین ریسرچ اینڈ ریسورس سنٹر (SAARC) اسلام آباد کے بارے میں ایس ڈی پی آئی کی تیار کردہ دستاویزی فلم بھی دکھائی گئی۔ ڈاکٹر حمیرا اشفاق کے مقالے کا موضوع چینی ادبیات کے اردو تراجم اور پاکستانی خصوصاً اردو ادبیات کے چین میں ہونے والے مطالعات سے عبارت تھا۔ ڈاکٹر شفقت سعید کے فکر انگیز مقالے میں کہا گیا کہ اگر چین، بھارت اور دیگر ممالک سے اختلافات کے باوجود ان سے قریبی تجارتی تعلقات قائم کر سکتا ہے تو یہ تعلقات پاک و ہند کے درمیان کیوں نہیں قائم ہو سکتے؟

سماجی احتساب

جوناتھن فوکس

خلاصہ:
احتساب کا تصور نچلی اور اوپر والی سطح سمیت اختیارات پر کنٹرول اور نچلی سطح سے اختیارات کے غلط استعمال کا احاطہ کرتا ہے۔
احتساب کے لیے بہتر تجویز یہ ہے کہ اس کے لفظی ترجمے کی بجائے اس کے تصور اور علاقائی ثقافت کے مطابق اس کو سمجھنا چاہیے۔
احتساب کے بنیادی تصور کو سمجھنے کے لیے یہ مضمون اس کے آغاز، تعمیر اور تبدیلی کے چھ مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے جن میں جاننے کا حق، وسل بلوؤر (کرپشن کی نشاندہی)، ایڈووکیسی، کھلا احتساب اور سماجی جوابدہی سمیت پاکستان، گوئٹے مالا اور فلپائن کی مثالیں شامل ہیں۔
نتیجے کے طور پر دو طرح کے نقطہ نظر سامنے آتے ہیں جن میں عوامی احتساب کی حکمت عملی جس میں پہلے سے موجود احتساب کرنے کے طریقہ کار جنہیں شاید نئے انداز سے آزمایہ جا سکتا ہے جبکہ دوسری طرف عوامی جوابدہی کے لیے نئے طریقہ کار نکالے جا سکتے ہیں جو شہریوں کے لیے قابل فہم ہوں۔

1۔ تعارف

احتساب کی اصطلاح کا مسئلہ محض کتابی نہیں ہے۔ احتساب کا مطلب مختلف کردار کے لیے مختلف، صورتحال کے مطابق اور مختلف زبانوں میں مختلف ہے۔ نتیجے کے طور پر احتساب کے تصور میں ابہام یا تو اس عمل کو روک سکتا ہے یا

اس میں بہتری اور عوامی جوابدہی کے لیے نئی راہیں کھولے گا۔

مزید تجزیہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ کس طرح مسائل کے حل کے لیے اختیارات کا استعمال کیا جاتا ہے۔(2) اس مضمون میں ایجنڈا سیٹنگ کے مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی سیاسی ابتدا اور متعلقہ چھ مختلف اصلاحات جو احتساب کے لیے استعمال کی جاتی ہیں اور اس کو سمجھنے کے لیے مختلف آسان مثالیں جن میں میکسیکو، امریکہ، فلپائن، پاکستان اور بھارت شامل ہیں۔

احتساب میں سب سے اہم مسئلہ اختیارات کا غلط استعمال اور استثنیٰ ہے جس پر کام کرنے کی ضرورت ہے چاہے یہ مسئلہ نچلی سطح پر ہو یا اوپر والی سطح پر، اس کو دوسری طرف دیکھیں تو کیا احتساب وراثتی طور پر تکنیکی، غیر ملکی اور اختیارات کے استعمال میں روشن خیال ہے جو کہ مقامی شہریوں، سماج اور شہریت سے جڑی ہوئی ہے؟ یا احتساب کا تصور بنیادی طور پر نظریاتی تصور ہے، ۔لہٰذا قابل اطلاق ہے۔ اصلاح کے طور پر دیکھیں تو یہ بحث بہت پیچیدہ ہے۔ اب تک اگر مختلف معاشروں میں احتساب کے تصور کا جائزہ لیں تو اس کا ترجمہ، درآمد شدہ اصلاح اور لفظا حتساب کی گردش نے پہلے سے موجود طریقہ کار کو مخلوط کر دیا ہے جس کے ذریعے مختلف کردار اس کے پیچھے موجود مسائل کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ یہ صرف شمال جنوب کا مسئلہ نہیں ہے یقیناً پہلا مسئلہ انگریزی میں احتساب کے مطلب کا ہے، احتساب واضح طور پر اختیارات کے استعمال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔لیکن جب گہرائی سے اس کا جائزہ لیا جائے تو سوال اٹھتا ہے کہ کون کس کو جواب دہ اور اس کا فیصلہ کون کرتا ہے؟

2۔ نچلی اور اوپر والی سطح پر احتساب کو سلجھانا

صحت کے نظام میں احتساب کی بات کرتے ہوئے سب سے پہلا مسئلہ جس کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وہ نچلی اور اوپر والی سطح پر احتساب کا فرق ہے۔ ڈویلپمنٹ سٹڈیز میں اس فرق کو غیر ملکی این جی اوز اور ان کے مقامی شراکتی اداروں پر لاگو کیا جاتا ہے جبکہ سیاسیات میں عمودی احتساب کا تصور پیش کیا جاتا ہے کہ ریاست شہریوں کے سامنے جوابدہ ہے۔ صحت کے سسٹم لیس برابری اور احتساب کو دیکھیں تو اوپر والی سطح پر احتساب میں صحت کی سہولت فراہم کرنے والا اپنے مینیجر کو رپورٹ کرتا ہے، جو کہ پالیسی بنانے والوں اور پالیسی بنانے والے غیر ملکی ڈونرز کو رپورٹ کرتے ہیں۔ جبکہ اس کے مقابلے میں نچلی سطح پر احتساب میں صحت کی سہولت فراہم کرنے والے اپنے مقامی شہریوں کو جواب دینے کے ذمہ دار ہیں۔ یہاں سوال اٹھتا ہے کہ کیا ہوگا جب اس کا اثر مخالف سمت میں ہو؟

احتساب کی سمت کا سوال گلوبل ہیلتھ سے متعلقہ ہے۔ جہاں اوپر والی سطح پر احتساب کا تصور پایا جاتا ہے کیونکہ صحت ڈونرز کے پیسے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے جس میں پیسہ وصول کیا جاتا ہے اور بدلے میں نتائج دیئے جاتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر احتساب کی اوپر والی سطح پر لے جاتا ہے جہاں سے فنڈ زآرہے ہیں نہ کہ نچلی سطح پر شہریوں کی طرف۔

مثال کے طور پر جہاں ڈونرز کی رپورٹنگ کی ضرورت ہوگی کہ صحت کا مانیٹرنگ سسٹم مضبوط ہو وہیں نتیجے کے طور پر اداروں کی طرف سے شہریوں کو ڈیٹا تک کم رسائی ملے گی۔ جہاں شہریوں کو معلومات تک رسائی کے کم موقع ملیں گے وہاں مسائل کی نشاندہی اوران کا حل ایک مشکل بات ہے جبکہ ڈونرز سے لیا گیا ڈیٹا اصل صورتحال تک پہنچ نہیں دیتا اور نہ ہی معیاری صحت کی ضمانت دیتا ہے۔

اوپر والی اور نیچے والی سطح کی احتساب میں فرق گلوبل صحت کے ساتھ جڑا ہوا ہے کیونکہ یونائٹڈ نیشنز کے اعداد وشمار قومی بہتری کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔

یہ نقطہ نظر احتساب کو قومی ترقی کی شکل میں ترجیح دیتا ہے، جو کہ ڈونرز سے متعلقہ ہے جہاں انہیں وسائل مختص کرنے سے متعلق مطلع کیا جاتا ہے اور نتائج کے حصول میں ناکامی کے نتیجے میں بین الاقوامی سطح پر بدنامی کا باعث بھی بنتا ہے۔

ابھی تک شہریوں، سماجی گروپس، کے پاس ایسے طریقہ کار موجود ہیں جو شہری، ضلع اور صوبہ کی سطح پر صحت کی سہولت کی کارکردگی کا جائزہ لے کر مسائل کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں تبدیلی کے خواہاں قومی سطح پر موجود اعداد کے ذریعے احتساب کو جانچتے ہیں جو کہ اوپر والی سطح پر ہے نہ کہ نچلی سطح پر احتساب کو۔

مختلف طریقوں سے جہاں مختلف قسم کے کردار احتساب کو بطور چیلنج پیش کریں، وہاں کیسے ممکن ہے کہ ہماری زبان مختلف طرز کے شہریوں احتساب کی جمہوری شکل پیش کر سکے؟

ان کے لیے جو عالمی انگریزی کے میدان میں کام کر رہے ہیں، تو ان کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ زبان کے جبر کے خلاف مزاحمت کریں، جس کو آسانی سے مسائل کے مفروضے میں سرکایا جا سکتا ہے جو کہ ثقافتی جبر کے ساتھ منسلک ہیں۔

دوسرے لفظوں میں کچھ ماہر انگریزی کہتے ہیں کہ اگر کسی انگریزی اصطلاح کا ترجمہ دوسری زبان میں موجود نہ ہو تو اس کلچر میں لوگ اس کے تصور سے بھی ناواقف ہوں گے۔

مثال کے طور پر وہ لوگ جو احتساب سے متعلق لاطینی امریکہ میں کام کر رہے ہیں ان کے لیے یہ آسان اور عام فہم ہے

جبکہ ہسپانوی اور پرتگالی میں یہ اصطلاح کم ہوگی۔

اس نقطہ نظر میں دو اہم مسئلے ہیں، پہلا یہ کہ سمجھا جاتا ہے کہ متبادل میں ایسے اصطلاح موجود نہیں ہے جو احتساب کے تصور کو بیان کر سکے۔ دوسرا یہ کہ جب براہ راست ترجمہ موجود نہیں ہوگا، لفظی جبریت کو لاگو کر کے سمجھا جائے گا، جس سے نئی اصطلاح جلدی سے نہیں ابھرے گی اور نہ ہی پھیلے گی۔

بنیادی طور پر اس مضمون کا مقصد احتساب کی حکمت عملی کو سمجھنے شہریوں کو پر اثر انداز میں گوش گزار کرنے کے لیے ایسی اصطلاح استعمال کی جائے جو ان کے لیے عام فہم ہو۔ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ یا تو پہلے سے موجود اصطلاح کو بہتر کیا جائے یا نئی اصطلاح ایجاد کی جائے جو عوام کے لیے قابل قبول ہو۔

باکس 1: پاکستان میں احتساب کی اصطلاح اور تصور

احتساب کی معنوی ولفظی اصطلاح تقریباً ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے، جن میں ذمے داری، شفافیت، شمولیت، شراکت، جوابدہی اور قانون کی حکمرانی شامل ہیں، جبکہ اردو کی اصطلاح میں احتساب کے لیے زیادہ موثر الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے جو کہ احتساب کے عمل کو مزید مضبوط طریقے سے پیش کرتا ہے۔

مثال کے طور پر "**Responsiveness**" لفظ کے لیے اردو میں "جوابدہی" استعمال کیا جاتا ہے جو نہ صرف متعلقہ شخص کو وقت پر جواب دینے کا پابند بناتا ہے بلکہ اسے کوئی خاص کام کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں جوابدہ بھی بناتا ہے۔ اسی طرح انگریزی زبان کا لفظ "**Rule of Law**" قانون کی حکمرانی کو واضح کرتا ہے۔ اسی طرح "**Transparency**" شفاف یا شفافیت سے مراد یہ ہے کہ حکومت جو بھی فیصلہ لے وہ عوام کی دسترس میں ہو اس کو حکومتی اداروں کی ویب سائٹس پر شائع کیا جائے تاکہ شہری فیصلہ سازی کے عمل سے متعلق جان سکیں اور شفافیت کا یہ تمام امور اور فیصلوں پر ہو نہ کہ صرف چند پر۔

2010ء میں سماجی تنظیموں نے سماجی احتساب کے تصور کو اجاگر کیا اور اس شعور کو معاشرے میں اجاگر کرنے میں سات سال لگے، جو شہری میڈیا پر سماجی احتساب کی بات کرتے ہیں تو اس کو ہم گڈ گورننس کی طرف اقدام کہہ سکتے ہیں۔

صحت کی سہولت کو بہتر کرنے کے لیے ریاست اوپر والی سطح پر احتساب کو فروغ دے رہی ہے جبکہ سماجی تنظیمیں اور ان کے بین الاقوامی اتحادی نچلی سطح پر احتساب کو فروغ دے رہے ہیں۔

مثال کے طور پر حکومت نے ضلع کی سطح پر ڈسٹرکٹ مانیٹرنگ آفیسر کو تعینات کیا جو کہ زیادہ تر فوج سے ریٹائرڈ ہوتے ہیں، جس کا مقصد دیہات و یونین کونسل کی سطح پر موجود ڈاکٹروں کی موجودگی کو مانیٹر کرنا ہے۔ حکومت اس سلسلے میں بائیومیٹرک حاضری سسٹم بھی استعمال کر رہی ہے اور اس حاضری سسٹم کو آسانی سے دھوکہ دیا جا سکتا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ مانیٹرنگ برائے مانیٹرنگ ہو رہی ہے۔

اس کے بعد پنجاب حکومت نے شہریوں سے براہ راست موبائل کے ذریعے فیڈ بیک لینا شروع کر دیا، جسے "سٹیزن فیڈ بیک ماڈل" کا نام دیا گیا، اس ماڈل کو مقامی زبان میں عوامی جوابدہی کا نظام کا نام دیا گیا، جس کا بنیادی مقصد صحت کی سہولت میں جوابدہی کے عمل کو مؤثر بنانا ہے۔

3۔ احتساب کے سیاسی تعمیر کی سات مثالیں

3.1۔ شفافیت

شفافیت کا تقاضا ہے کہ شہریوں کو معلومات تک رسائی دی جائے جو کہ ریاست نے اپنے ہاتھوں میں رکھی ہوئی ہے، یہ ایک مسئلہ ہے، خاص طور پر صحت میں جہاں حکومت اہم معلومات اکٹھی کرتی ہے، مثال کے طور پر حکومت اس بات کا شاز و نادر ہی ریکارڈ رکھتی ہے کہ ملکی آبادی کے لیے کونسی ادوایات کی کس مقدار میں ضرورت ہے۔

گھروں، کھیتوں، فیکٹریوں میں زہریلی ادوایات استعمال کی جاتی ہیں جن میں کیڑے مار ادوایات بھی شامل ہیں، جو کہ انسانی جانوں کے لیے بھی خطرہ ہیں۔

لاطینی امریکہ میں شفافیت کی اصطلاح مختلف کردار استعمال کرتے ہیں جن میں سیاسی کردار بھی شامل ہیں شاید مختلف ماہرین اس کا زیادہ اچھا استعمال کرتے ہیں۔ اوپن گورنمنٹ کی اصطلاح کی گونج خطے میں پھیلی ہے، لیکن یہ ابھی تک ان ابتدائی معلومات تک محدود ہے جو ریاست اکٹھا کرتی ہے۔

ہسپانوی اصطلاح "ٹرانسپیریشیا" کو ہم یہاں مثال کے طور پر لیتے ہیں جو کہ ایک مقبول اصطلاح بنی، 20 سال قبل میکسیکو میں سماجی تنظیم کے دوستوں نے اس اصطلاح کو ہٹانے سے قبل جان بوجھ کر اس کو زوردار جھٹکا دیا تا کہ مقامی سطح پر اس کو اپنایا جا سکے، انہوں نے ہسپانوی زبان میں متبادل کے طور چھوٹا لفظ استعمال کیا جو ابھی تک قانونی طور پر جائز ہے جو کہ ٹرانسپرنسی کے متبادل کے طور پر پیش کیا گیا جس کو "ٹراسپریشیا **Trasparencia**" کہتے ہیں جو کہ لفظ میں استعمال ہونے والا پہلا " **N** " حذف کر جاتا ہے جو کہ عام طور پر لفظ "ٹرانسپریشیا **Transparencia**" میں استعمال کیا جاتا ہے۔

منتظمین ایک بات پر خاص طور پر فکرمند تھے کہ مقامی طور استعمال ہونے والی اصطلاح لوگوں میں زیادہ مشہور ہو گی جو کہ مقامی سطح پر لفظ فراڈ کے لیے ٹرانسا Transa استعمال کی جاتی تھی۔

دوسری وجہ بھی تھی جس نے منتظمین کو لفظ کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی اجازت دی، "Traslasaparencias" جس کا مطلب تھا کہ ایسے معلومات کے پیچھے جانے کی ضرورت ہے جو ظاہر میں موجود نہیں، یہ ایک خیال تھا گورننس کے معاملات کو مزید شفاف بنانے کا، ان کے لوگو Logo نے بھی دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا 'Tras-Parencia'

ایک تیسری وجہ تھی کہ اس وقت میکسیکن انٹرنیٹ کی سہولت فراہم کرنے والا LaNeta تمام حروف کو سنبھال نہیں سکا لیکن Transparencia استعمال ہونے لگ گیا۔

3.2 جاننے کا حق:

اس کے برعکس "جاننے کا حق" کا ٹرانسپرنسی سے زیادہ وسیع ہے، یہ معلومات تک رسائی کا وسیع تصور دیتا ہے جس سے احتساب کی ناکامی سے نمٹا جا سکے۔ مثال کے طور پر ہسپانوی زبان میں لفظی ترجمہ زیادہ وسیع اور عام فہم ہے: 'derecho a saber' جس کو گوگل پر ایک کروڑ 10 لاکھ مرتبہ تلاش کیا گیا ہے۔ بھارت میں 1996 میں قومی سطح پر جاننے کی مہم 'رائٹ ٹو نو' جاننے کا حق اور 'رائٹ ٹو لو' زندہ رہنے کا حق چلائی گئی۔ اس مہم نے نچلی سطح پر مزدور کسان شکتی سنگھٹن تحریک کو متاثر کیا، جنہوں نے سماجی انصاف اور رشوت کے خلاف مہم میں مطالبہ کیا کہ حکومت کی طرف سے غربت مکاؤ پروگرام سے متعلق معلومات تک رسائی فراہم کی جائے۔

یہ اصطلاح امریکہ میں ماحولیاتی صحت پر کام کرنے والوں نے وسیع پیمانے پر استعمال کی جس کے نتیجے میں 1986 میں کانگریس نے ایمر جنسی اینڈ کمیونٹی رائٹ ٹو نو ایکٹ پاس کر دیا۔ قانون نے نچلی سطح پر زہر مخالف اور 1984 میں بھارت کے بھوپال میں ہونے والی تباہی کی طرف مائل کیا، قانون نے صنعتکاروں کو پابند کیا کہ وہ صنعتوں سے نکلنے والے زہر کی مقدار سے متعلق حکومت کو مطلع کریں۔ مفاد عامہ کے ایک گروپ نے تمام ڈیٹا آن لائن فراہم کیا تاکہ شہریوں کو آن لائن معلومات با آسانی دستیاب ہوں۔

تبدیلی کے اس قدم کے اٹھانے کا مقصد تھا کہ اگر شہریوں کو مذکورہ مسئلے پر معلومات دستیاب ہوں تو وہ اس مسئلے پر آواز اٹھا سکتے ہیں، جس سے شہریوں کو گورننس کے عمل پر نظر رکھنے کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ جبکہ 1986 کے قانون نے زہر کے انکشاف پر قانون کا معیار بلند نہیں کیا، اس قانون نے پہلے سے موجود قوانین کو تقویت دینے میں مدد دی۔

قانون پر عمل درآمد ہونے کے بعد پہلے دس سالوں میں ڈرامائی انداز میں زہر کے اخراج کی مقدار تیزی سے نیچے آ گئی۔

3.3 وسل بلوؤر

احتساب کی ایک اہم مثال وسل بلوؤر ہے جس کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنا مشکل ہے۔ ہسپانوی میں اس کے ترجمے کا منفی تاثر ہے جسے Denunciate ، informante کہتے ہیں، جس کا مطلب خبری، چیخنا ہے۔ یہ میراث بہت سے معاشروں میں موجود رہی ہے خاص طور پر آمرانہ حکومتیں آج بھی وسیع پیمانے پر مخبر تعینات کرتی ہیں۔

ابھی تک اسی وقت میں، وسل بلوؤر جس کے ملتے جلتے مطلب ہیں اور انگریزی میں ابھی بھی یہ اصطلاح سیاسی معنوں

میں استعمال ہوتی ہے۔

یہ اصطلاح صرف سپورٹس ریفری اور پولیس والے کی طرف اشارہ کرتی ہے جو کسی غلطی پر سیٹی بجاتا ہے، 1969 میں پروواز پریس اس اصطلاح کو رون رائڈنہور Ron Ridenhour کو بدنام کرنے کے لیے کرتا تھا، امریکی سپاہی جس نے بدنام مائی لائی میں عام شہریوں کے قتل عام کے لیے وسل بجائی۔

1970 کے شروع میں صارفین کے حقوق کی مہم نے وسل بلوؤر کی اصطلاح کا استعمال کیا، اب یہ اصطلاح شہریوں کو اچھی خدمات کی طرف اشارہ کرتی ہے، ان اداروں کی طرف سے جو کہ مضبوط اداروں میں موجود ہیں اور بدعنوانی اور معلومات کے انکشاف کا خطرہ مول لیتے ہیں، چاہے اندرنی ہو یا عوامی۔

ایک اور اصطلاح TruthTeller سچ بتانے والا استعمال کی جا رہی ہے جو کہ امریکہ میں اب وسیع پیمانے پر استعمال ہوتی ہے۔

3.4 ایڈووکیسی

احتساب کے لیے یہ اصطلاح نصف صدی قبل استعمال میں آئی، اصل میں یہ اصطلاح وکلا کے لیے استعمال ہوتی ہے جو اپنے مؤکل کے دفاع کے لیے ایڈووکیسی کرتے ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ اصطلاح پھیلتی گئی اور مختلف خدمات فراہم کرنے والے اس کو استعمال کرنے لگ گئے جیسا کہ سماجی ورکرز جو اپنے مؤکل کے مفاد کا تحفظ کرنے کے لیے ایڈووکیسی کرتے ہیں۔

امریکہ میں یہ اصطلاح امن تحریکوں، نسل، صنفی انصاف 1960 اور 1970، یہ اصطلاح وسیع پیمانے پر استعمال ہونا شروع ہوگئی جس میں پسے ہوئے طبقات کے حقوق کے دفاع کے لیے ایڈووکیسی کی گئی۔

مفاد عامہ کے لیے کی جانے والی ایڈووکیسی کا سب سے بڑا چیلنج ایک منظّم طریقے سے سماج کو نکالنا ہے،

ابھی بھی امریکہ میں یہ اصطلاح اپنے اصل سیاسی مرحلے میں مختلف اثرات رکھتی ہے، 1960 کے بعد آزاد خیال پالیسی میکرز کی جماعت نے انسداد رشوت ستانی کے پروگرام ایڈووکیسی پلاننگ میں کمیونٹی کی شمولیت کو فروغ دیا۔ اس وقت پالیسی بنانے والوں پر تنقید کی گئی کہ انہوں نے صرف پاپر چینل کے ذریعے شرکت کی بات کی ہے، جس کو آپ **Invited Space** کہا جاتا ہے، جس کو ناقص پالیسی کا نتیجہ قرار دیا گیا۔

اشرافیہ کے لیے ممکنہ طور پر اندر موجود وکلا نے پائیدار طاقت کے انتقال کو فروغ دیا جو کہ نمایاں طور پر یا تو ہم آہنگی سے یا پھر سماجی حلقوں کو متحرک کر کے ہونا تھا۔

دوسرے لفظوں میں اندرونی مفاد عامہ کے اقدامات اور عوامی احتجاج ممکنہ طور پر دوبارہ اسے جوڑ سکتا ہے، جیسا کہ میکسیکن کا 'سینڈوچ سٹریٹیجی کیس'، ثقافتی طور اسے فلپائن کے تناظر میں اپناتے ہوئے، جہاں بعد میں اسے چھوڑ دیا گیا، جو کہ بعد میں قومی سول سوسائٹی آرگنائزیشن اور پالیسی ریفارمز میں سرایت کر گیا۔

باکس2

فلپائن میں احتساب کا تصور جسے **'bibingkastrategy'** کا نام دیا گیا۔

دی ببینکا سٹریٹجی ایک مشہور تکنیک ہے جسے فلپائن میں سماجی تنظیموں کی طرف سے احتساب کے فروغ کے لیے استعمال کیا گیا۔

اس حکمت عملی کو اپناتے ہوئے تجویز دی گئی کہ اصلاحات ہوتی ہیں اگر نچلی سطح سے شہریوں کا پریشر برقرار رہے اور اوپر والی سطح پر ریاستی عناصر ضروری اقدامات کریں۔

نچلی سطح سے سماجی تنظیموں کی طرف سے متبادل پالیسیز اور پالیسیز پر بہتر انداز میں عمل درآمد کرنے کے لیے دباؤ ڈالا گیا۔

دوسری طرف اوپر والی سطح پر اقدامات جو کہ ریاست کی طرف سے خدمات کی فراہمی اور ناکامی کو ختم کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔

بیبنگا اسٹریٹجی کی اصطلاح فلپائن کے سکالر سٹرنینو براس نے اپنی ایک سٹڈی "ایگریرین ریفارم امپلی مینٹیشن ان دی فلپائن "1999 میں متعارف کروائی۔

یہ بیبنگا لفظ فلپائن میں بننے والے چاول کے کیک سے نکلا ہے، جہاں کیک کو بیک کرنے کے مرحلے میں اس کے اوپر نیچے چاکلیٹ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

بیبنگا سٹریٹیجی فوکس کے سینڈوچ سٹریٹجی تصور سے نکلی ہے، جو کہ نچلی اور اوپر والی سطح پر احتساب کی دشمن طاقتوں سے نمٹنے کے لیے مشترکہ طور پر کام کرتی ہیں۔

یہ یقیناً براہ راست ایک درست ترجمہ تو نہیں ہے لیکن بیبنگا سٹریٹجی کی اصطلاح کو استعمال کرتے ہوئے اس بات کا فائدہ ہے کہ فلپائن میں لوگ اس کو فوری طور پر سمجھ جاتے ہیں۔

لیکن فلپائن میں جب لوگ بیبنگا سٹریٹجی کا لفظ سنتے ہیں تو فوری طور پر اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔"**'apoysataas at apoysa baba**' مطلب **Fire on top and fire below**

ہسپانوی میں احتساب کا لفظی مطلب "Abogacia" ہے جس کا مطلب قانون کا استعمال کرنا ہے، اس کے برعکس بڑے پیمانے پر کسی تیسرے فریق کے لیے حکام کے کام میں مداخلت کرنے ہے۔ ہسپانوی اصطلاح "Gestoria" ایک آپشن ہوسکتی ہے، لیکن اس کا نقصان یہ ہے کہ یہ محدود ہے اور صرف مادی اشیاء پر رعایت کی حد تک محدود ہے۔ ڈیفینسوریا "Defensoria" واضح طور پر کاص صورتحال میں اس سے متعلق بات کرتا ہے، لیکن یہاں بھی ایک سوال ہے کہ کیا اس میں مفاد عامہ کی بات ہے یا نہیں۔ اس میں کولمبین حکومت کا لوگوں کے دفاع ایک قابل ذکر کیس ہے۔

گاوٗٹے مالا میں مقامی سطح پر صحت کے حقوق کا دفاع کرنے والے وسیع پیمانے پر اس اصطلاح کا استعمال کرتے ہیں، جس میں صنفی شمولیت کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے جو کہ ہسپانوی میں ہے جیسا کہ "Defensor" اور "Promocion"" بھی استعمال کی جاسکتی ہیں، شروع ہی سے اسے بڑے پیمانے سے نچلی سطح پر اکٹھے ہونے کے لیے استعمال کیا گیا، لیکن یہ پالیسی ایڈووکیسے کے لیے استعمال نہیں کی جاسکتی۔

کچھ Cabildeo کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں جو کہ خاص طور پر قومی سطح پر پالیسی بنانے والی اشرافیہ کا حوالہ دیتی ہے جو کہ عوامی پالیسی پر اثر انداز ہونے کا ایک طریقہ ہے۔ ایڈووکیسی کے لیے استعمال ہونے والی ہسپانوی اصطلاح اب لاطینی امریکہ میں Incidencia ہے جس کا مطلب اثر انداز ہونا ہے۔

یہ اصطلاح 1990 میں کراس بارڈر ڈائیلاگ میں یو ایس اور سینٹرل امریکہ میں ہونے والی انسانی حقوق گروپس اور مفاد عامہ کے گروپس کے درمیان ہونے والی بات چیت میں ایجاد ہوئی جس میں سماجی تنظیموں نے احتجاج سے تجویز کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔

3.5 اوپن واشنگ

حال ہی میں ایک نئی مثال اوپن واشنگ سامنے آئی ہے، جو کہ مضبوط اداروں کے اقدامات کی طرف اشارہ کرتی ہے جو کہ شفافیت کو فروغ دینے کے لیے سامنے آتے ہیں، لیکن اصل میں صدر کی طرف سے اختیارات کے غلط استعمال اور استثنیٰ کو چھپاتے ہیں۔ شروع کے دس سالوں کے بعد وسیع پیمانے پر شفافیت کے لیے کیے جانے والے اقدامات کبھی کبھار احتساب کے نتائج دینے میں ناکام رہے۔

مثال کے طور پر جب گاوٗٹے مالا نے اوپن گورنمنٹ پارٹنرشپ میں شمولیت اختیار کی نائب صدر گورنمنٹ فالواپ کی انچارج تھی، لیکن بعد میں اس نے رشوت کے جرم میں قید کو ختم کر دیا جس سے صاف ہوا کہ اس کے پاس چھپانے

کو بہت کچھ ہے۔

یہ اصطلاح ایک اور اصطلاح وائٹ واشنگ کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کا مطلب غلط اقدامات کو چھپانا ہے۔

1989 کے آغاز میں مختلف اقسام سامنے آئیں جب گرین پیس **"Green Peace"** "اینٹی ٹاکسس مہم نے گرین واشنگ کی اصطلاح کو متعارف کروایا، جس نے وضاحت کی کس طرح کارپوریشنز ماحول دوست ہونے کی سندر کھنے کا دعویٰ کرتی ہیں جبکہ ان کا کاروبار واضح طور پر ماحول دشمن ہے۔

ابھی بھی اوپن واشنگ کے تصور کو متعارف کروانا ایک چیلنج ہے، جو کہ کمزور شفافیت کے اقدامات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کہ مسلسل احتساب کی ناکامی ساتھ موجود ہے اور جان بوجھ کر احتساب کی ناکامی پر پردہ ڈالنے کی کوششیں کرتا ہے۔ ابھی تک صرف دوسری اصطلاح جس میں اوپن واشنگ شامل ہے جس کو ارادے سے دھوکہ دینے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔

3.6 سماجی احتساب:

تقریباً دس سال قبل سماجی احتساب کی اصطلاح نے بڑے ترقیاتی اداروں جن میں ورلڈ بینک اور بڑی غیر ملکی این جی اوز شامل ہیں نے نئی سیاسی راہ کھول دی جس میں شہریوں کی آواز کو بلند کرنے پر زور دیا گیا۔ گوگل پر 4 لاکھ 85 ہزار صارفین نے سماجی احتساب کو سرچ کیا اگر چہ اس میں سماجی احتساب کے دوسرے معنی کا استعمال بھی شامل ہے۔

اس کے پھیلاؤ کے باوجود غیر انگریزی زبانوں میں احتساب کا براہ راست ترجمہ موجود نہیں، جب کوئی لفظ سماجی کی صفت استعمال کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں سینکڑوں ہسپانوی اصطلاحیں سماجی احتساب کے لیے موجود ہیں۔ بڑے پیمانے پر سرکاری اداروں میں سوشل اوور سائٹ کے لیے استعمال ہونے والی اصطلاح جس میں

Contraloria Social, control ciudadano, veeduria, auditoria social

اور control social شامل ہیں، جو کہ سب ریجن کی طرف سے مختلف استعمال کے ساتھ اور لاطینی امریکہ میں اضافی وقت کے ساتھ۔

ان تمام اصطلاحوں کا استعمال ہسپانوی میں اس وقت ختم ہو گیا جب انگریزی دان ترقیاتی اداروں کی طرف سے سماجی احتساب کی اصطلاح کا استعمال شروع ہو گیا، جس کو حکومت اور مفاد عامہ کے گروپس نے بھی اپنایا۔ مثال کے طور پر **contraloria social** کی اصطلاح پہلی دفعہ 1990 کے شروع میں میکسیکن حکومت کی طرف سے اپنائی گئی جس کو سرکاری اداروں کی سیٹیزن اوور سائٹ کے لیے استعمال کیا گیا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگر کوئی ان ملتی جلتی اصطلاحوں کے لیے گوگل سرچ کا شمار کرے تو اس کو غیر متوقع نتائج ملیں گے، وہ انگریزی کی اصطلاح سماجی احتساب سے زیادہ وسیع پیمانے پر استعمال ہو رہے ہیں۔

Figure 1 Comparing usage of social accountability terms in English as Spanish

Table here

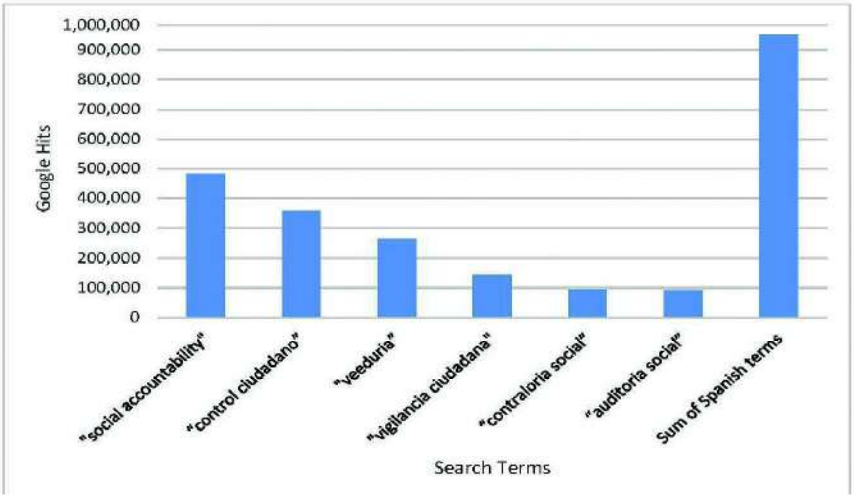

ٹیبل میں موجود ڈیٹا 10 دسمبر 2017 کو گوگل سےلیا گیا ہے، تمام تلاش اقتباس میں تھی۔ ہسپانوی اصطلاح کو ہسپانوی میں تلاش کیا گیا، سماجی احتساب کے لیے انگریزی کا استعمال کیا گیا۔

جب سے کثیر اصطلاحیں ہسپانوی میں استعمال کی گئی ہیں، تو اس کے برابر انگریزی میں اصطلاحیں تلاش کی گئی ہیں، جیسا کہ سیٹیزن اوور سائٹ کو ایک لاکھ 21000 مرتبہ اور سوشل آڈٹ کو ایک لاکھ 12 ہزار مرتبہ سرچ کیا گیا۔ ہسپانوی کی کل تعداد ابھی بھی زیادہ ہوگی اور سوشل آڈٹ کی اصطلاح زیادہ تر سوشل اکاؤنٹبلٹی کے معنوں میں سامنے نہیں آئی۔

اس کے لیے میں کرس ولسن کا شکر گزار ہوں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ سوشل اکاؤنٹبلٹی کے لیے ہسپانوی کی ایک اور اصطلاح' کنٹرول سوشل'3 ملین اضافی گوگل ہٹس شامل کرے گی لیکن اسے یہاں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ بعض اوقات اس کو سوشل اکاؤنٹبلٹی کی بجائے Concept کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

میں جولیا فسچر میکی کا شکر گزار ہوں جنہوں نے تحقیق میں مدد فراہم کی۔

باکس3:

Different understanding of 'Control Social' in Latin America

ہسپانوی زبان کی اصطلاح control social گورنمنٹ اوراس کی تنظیموں کی طرف سے سوشل اوور سائٹ کے لیے جنوبی امریکہ میں بڑے پیمانے پر استعمال ہوچکی ہے۔ بولیویا، برازیل، ایکیوڈر اور کولمبیا میں یہ اصطلاح اکثر قومی قوانین اور پالیسی بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔
تاریخی اعتبار سے اس کا اصل مقصد سرکاری اداروں کی نگرانی شہریوں کے ہاتھ میں دینا تھا جس کو جمہوریت کے ساتھ جوڑا گیا۔
سماجی تنظیموں کی طرف سے بھی اس اصطلاح کو تربیتی کتابچوں میں شامل کیا گیا جو کہ آن لائن موجود ہیں۔
حال ہی میں جنوبی امریکہ میں ایک متحرک نوجوانوں نے 'rendicion de cuentas' کی اصطلاح کنٹرول سوشل سے زیادہ استعمال کی ہے۔
سنٹرل امریکہ میں اس کے برعکس کنٹرول سوشل کی اصطلاح مختلف انداز میں سمجھی جاتی تھی جس کو اتنی پذیرائی نہیں ملی۔
مثال کے طور پر گاوٹے مالے اور ای آئی سلویڈر میں الفاظ حکومت کے ساز باز کے ساتھ منسلک ہیں اور ظاہری طور پر لفظی ترجمہ انگریزی میں سوشل کنٹرول ہے۔

4۔ نتیجہ

اگر پیچھے مڑکر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح پبلک احتساب کے لیے موئثر انداز میں حکمت عملی تیار کی جاتی ہے ایسی اصطلاح کو استعمال کرتے ہوئے جس کی گونج تمام ثقافتوں، زبانوں میں پھیلے، یہ مضمون دو طرح کے راستے تجویز کرتا ہے۔

1- پہلے سے موجود جملے اور اصطلاح کو دوبارہ مناسب کرنے کے لیے اسی مشہور کلچر میں تلاش کریں، ممکن ہے کہ ذاتی جملوں کا مطلب عوامی جملوں میں بن جائے۔

2- اپنی صلاحیت کو کھلا چھوڑیں جو پبلک احتساب کے لیے نئے آئیڈیاز تلاش کرے اور ان کی صلاحیت کو وہ

وائرل ہو جائیں کیونکہ وہ عام فہم سمجھ کے ساتھ شفاف اور گونجتے ہیں۔

نتیجے کے طور پر شفافیت، شراکت داری اور احتساب کے ابھرتے ہوئے میدان کو ضرورت ہے کہ احتساب کو ابھارنے کے لیے بنیادی قدم اٹھائے جائیں۔ اس میں اصطلاحی اور کراس کلچر ترجمہ شامل ہے نہ کہ براہ راست لفظی ترجمہ کیا جائے۔

References

Abadzi, H. (2017) Accountability and its Educational Implications: Culture, Linguistics and Psychological Research, Background Paper prepared for the 2017/2018 Global Education Monitor Report, United Nations Educational, Scientific and Cultural Organization (UNESCO), http://unesdoc.unesco.org/images/0025/002595/259573e.pdf (accessed 26 January 2018)

Borras, S. Jr. (1999) The Bibingka Strategy in Land Reform Implementation: Autonomous Peasant Movements and State Reformists in the Philippines, Quezon City: Institute for Popular Democracy

Boydell, V.; Fox, J. and Shaw, S. (2017) Transparency and Accountability Strategies & Reproductive Health Delivery Systems, Learning Exchange Report 1, Washington DC: Accountability Research Center, School of International Service, American University, http://accountabilityresearch.org/web/wpcontent/uploads/2017/11/Learning_Exchange_Report1_Sept17_11-14-17.pdf (accessed 26 January 2018)

Brockmyer, B. and Fox, J. (forthcoming, 2018) 'What is Open-Washing?', Washington DC: Accountability Research Center, School of International Service, American University

Cornwall, A. and Eade, D. (eds) (2010) Deconstructing Development Discourse: Buzzwords and Fuzzwords, Bourton on Dunsmore: Practical Action/Oxfam GB, https://policypractice.oxfam.org.uk/publications/deconstructing-development-discourse-buzzwords-andfuzzwords-118173 (accessed 26 January 2018)

Dubnick, M. (2014) 'Accountability as a Cultural Keyword', in M. Bovens, R.E. Goodin and T. Schillemans (eds), The Oxford Handbook of Public Accountability, Oxford: Oxford University Press

Fancy, H. and Razzaq, J. (2017) Accountability in Education in Pakistan, Background Paper prepared for the 2017/2018 Global Education Monitor Report, UNESCO, http://unesdoc.unesco.org/images/0025/002595/259549e.pdf (accessed 26 January 2018)

Fox, J. (2017) History and Language: Keywords for Health and Accountability, IDS blog, 4 August, www.ids.ac.uk/opinion/history-and-language-keywords-for-health-andaccountability (accessed 26 January 2017)

Fox, J. (2016) 'Transparency and Accountability: Unpacking Keywords', presented to the John D. and Catherine T. MacArthur Foundation, 14 June, https://jonathan-fox.org/lectures/ (accessed 26 January 2017)

Fox, J. (2007a) 'The Uncertain Relationship Between Transparency and Accountability', Development in Practice 17.4-5: 663-71

Fox, J. (2007b) 'Contrasting Theory and Practice: The World Bank and Social Capital in Rural Mexico', in J. Fox, Accountability Politics: Power and Voice in Rural Mexico, Oxford: Oxford University Press, https://jonathanfoxucsc.files.wordpress.com/2011/11/fox_contrasting_theory_and_practice_wb_and_sc_ch_6_in_accountability_politics.pdf (accessed 26 January 2017)

Fox, J. (2001) 'Vertically Integrated Policy Monitoring: A Tool for Civil Society Policy Advocacy', Nonprofit and Voluntary Sector Quarterly 30.3: 616-27, http://escholarship.org/uc/item/07s6x64j (accessed 26 January 2017)

Fox, J. (1992) The Politics of Food in Mexico: State Power and Social Mobilization, Ithaca: Cornell, https://books.google.com/books?id=QKZSyZdXU3sC&printsec=frontcover&dq=The+Politics+of+Food+in+Mexico&hl=en&ei=MLbRTvCTBejmiAKmidm7Dw&sa=X&oi=book_result&ct=result&resnum=1&ved=0CDYQ6AEwAA#v=onepage&q=The%20Politics%20of%20Food%20in%20Mexico&f=false (accessed 26 January 2017)

Fung, A.; Graham, M. and Weil, D. (2007) Full Disclosure: The Perils and Promise of Transparency, Cambridge: Cambridge University

Gomes de Pinho, J.A. and Silva Sacramento, A.R. (2009) 'Accountability: Já Podemos Traduzi-la para o Português?', Revista de Administração Pública 43.6: 1343-68

Grant, R. and Keohane, R. (2005) 'Accountability and Abuses of Power in World Politics', American Political Science Review 99.1: 29-43
Hevia de la Jara, F. (2009) 'Contraloría Social y Control Ciudadano en los Programas Sociales', in D. Gómez Álvarez (ed.), Candados y Contrapesos: La Protección de Programas Sociales, Políticas, y Derechos Sociales en México y América Latina, Guadalajara: Instituto Tecnológico y de Estudios Superiores do Occidente ITESO/United Nations Development

Programme (UNDP), https://rei.iteso.mx/bitstream/handle/11117/224/Candado%20y%20contrapeso.pdf?sequence=2 (accessed 26 January 2017)

Khaitan, T. (2009) 'Dismantling the Walls of Secrecy', Frontline 26.4<B: no page numbers>

Kilby, P. (2006) 'Accountability for Empowerment: Dilemmas Facing Non-Governmental Organizations', World Development 34.6: 951-63

Malena, C. with Forster, R. and Singh, R. (2004) Social Accountability: An Introduction to the Concept and Emerging Practice, Social Development Papers: Participation and Civic Engagement Paper 76, Washington DC: World Bank, http://documents.worldbank.org/curated/en/327691468779445304/pdf/310420PAPER0So1ity0SDP0Civic0no1076.pdf (accessed 26 January 2017)

Martinez, D.E. and Cooper, D.J. (2017) 'Assembling International Development: Accountability and the Disarticulation of a Social Movement', Accounting, Organizations and Society 57: 18-32<B: no issue number>

McGee, R. and Kroesschell, C. (2013) Local Accountabilities in Fragile Contexts: Experiences from Nepal, Bangladesh and Mozambique, IDS Working Paper 422, Brighton: IDS, https://www.ids.ac.uk/publication/local-accountabilities-in-fragile-contexts-experiencesfrom-nepal-bangladesh-and-mozambique (accessed 26 January 2017)

Mckinley, A. (2002) Manual Básico para la Incidencia Política, Washington DC: Washington Office on Latin America

Nader, R.; Petkas, P. and Blackwell, K. (1972) Whistle Blowing: The Report of the Conference on Professional Responsibility, New York NY: Grossman Publishing

O'Donnell, G. (1998) 'Horizontal Accountability in New Democracies', Journal of Democracy 9.3: 112-26

Pande, S. (2014) 'The Right to Know, the Right to Live: Grassroots Struggle for Information and Work in India', doctoral thesis (PhD), University of Sussex

Pettit, J. and Wheeler, J. (2005) 'Development Rights? Relating Discourse to Context and Practice', IDS Bulletin 36.1, http://bulletin.ids.ac.uk/idsbo/article/view/1038 (accessed 26 January 2017)

Piven, F.F. (1975) 'Whom Does the Advocate Planner Serve?', in R. Cloward (ed.), The Politics of Turmoil: Essays on Poverty, Race and the Urban Crisis, New York NY: Vintage Books

Puck, L. (2017) 'Mexico's Private Security Dilemma: Understanding the Relationship between the Mexican State and the Private Security Industry', PhD dissertation, Politics Department, University of California

Roy, A. and Dey, N. (2015) 'RTI On My Side', The Indian Express, 12 October

Schaaf, M. et al. (forthcoming) 'Report on the "Think-In" on Community Health Worker Voice, Power, and Citizens' Right to Health', Learning Exchange Report 3, Washington DC: Accountability Research Center, School of International Service, American University

Schedler, A. (1999) 'Conceptualizing Accountability', in A. Schedler, L. Diamond and M. Plattner (eds), The Self-Restraining State: Power and Accountability in New Democracies, Boulder: Lynne Reinner

Sriskandarajah, D. (2017) 'Can INGOs Push Back against Closing Civic Space? Only if they Change their Approach', From Poverty to Power, Oxfam blog, 13 October, http://oxfamblogs.org/fp2p/can-ingos-push-back-against-closing-civic-space-only-if-theychange-their-approach (accessed 26 January 2017)

Stephenson, M. (2017) 'The Swahili Word for Transparency, and the Fallacies of Linguistic Determinism', GAB: The Global Anti-Corruption Blog, 1 August, https://globalanticorruptionblog.com/2017/08/01/the-swahili-word-for-transparency-and-thefallacies-of-linguistic-determinism/ (accessed 26 January 2017)

UNESCO GEM (2017) Global Accountability Monitoring Report 2017/2018. Accountability in Education: Meeting Our Commitments, Paris: UNESCO, (accessed 26 January 2017)

شاہ : کل اور آج

احمد سلیم

اٹھارہویں صدی کے عظیم شاعر، عاشق اور انقلابی، شاہ عبدالطیف بھٹائی زمین اور زماں کے دائرے سے بلند ہو چکے ہیں۔ انہوں نے سندھ کی دھرتی پر جنم لیا اور اٹھارہویں صدی میں سندھ کے دکھوں کے جام پیئے لیکن جب انہوں نے اس زمین اور اس زمانے کو تخلیقی اظہار کے سانچے میں ڈھالا تو ان کی آواز صدیوں پر اور دھرتی کے کونے کونے تک پھیل گئی۔ جب آپ کی تخلیقی جڑیں زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں اور جب آپ اس عہد کے لوگوں کی آسوں پیاسوں کے ترجمان بن جاتے ہیں تو آپ صرف کسی خاص خطہء زمین تک محدود نہیں رہتے۔ نہ کسی خاص زمانے کے قیدی بن کر رہ جاتے ہیں۔ یوں بھی شاہ کا سندھ محض اٹھارہویں صدی کا سندھ نہیں تھا۔ اس کے ڈانڈے ہزاروں سال قدیم زمانوں سے جا ملتے ہیں۔ سندھ ایک عظیم تہذیبی امتزاج کے تجربے سے گزرا۔ اس دھرتی نے ہزاروں برس سے مختلف قوموں، تہذیبوں، زبانوں اور مذہبوں کا ذائقہ چکھا ہے۔ سبط حسن کے بقول ''اسوری، دراوڑ، آریہ، ساکا، کُشان، ہُن، عرب، افغانی، ایرانی، ترک، مغل کون ہے جو یہاں نہیں آیا۔ آخر خود شاہ کے اجداد بھی تو باہر سے آ کر یہاں بسے تھے اور حالیہ دھائیوں میں سندھی پہچان کے سب سے بڑا نشان، سب سے بڑی علامت جی ایم سید کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ جنہوں نے شاہ کو اس طرح سمجھا جیسے سندھ کا ایک ہاری سمجھتا ہے اور سندھ کو اس طرح اپنے وجود کا حصہ بنایا، جیسے سندھ اور سید ایک ہو گئے ہوں۔ ''شاہ جو رسالو'' اس اجمال کی تفصیل ہے۔

پہلے کچھ پرانی باتیں دہرا لیں: شاہ لطیف سترھویں صدی کی آخری دہائی میں ۱۶۹۰ء میں ہالہ ضلع حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کے والد سید حبیب اپنے آبائی گاؤں کو چھوڑ کر کوٹری میں آباد ہو گئے۔ شاہ کے آباؤاجداد پندرھویں صدی کے آغاز سے ہرات سے نقل مکانی کر کے سندھ میں آباد ہوئے تھے۔ ان

کے بارے میں یہ متھ تاریخی طور پر رد کی جا چکی ہے کہ وہ اُمّی تھے۔اس لئے اس پر بحث کر کے وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ان کے عشق کی کہانی بھی بار بار دہرائی جا چکی ہے۔لیکن اسے ایک بار پھر دہرانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

''سید حبیب کے ایک خوشحال مرید مرزا مغل بیگ ارغون بھی کوٹری میں رہتے تھے۔مرزا کے گھر میں اگر کوئی بیمار ہوتا تو سید حبیب کو علاج اور دعائے صحت کے لئے بلایا جاتا تھا۔ایک بار مرزا ارغون کی جوان بیٹی بیمار ہوئی تو حسب معمول سید حبیب سے درخواست کی گئی۔اتفاق سے ان کی طبیعت بھی اچھی نہ تھی۔لہٰذا انہوں نے شاہ عبداللطیف کو مرزا ارغون کے پاس بھیج دیا۔شاہ لطیف مسیحائی کرنے لگے تھے لیکن خود تپ عشق میں مبتلا ہو گئے۔مرزا ارغون کو خبر ہوئی تو وہ شاہ لطیف کے خاندان کے درپے ہو گیا۔سید حبیب نے بھی بیٹے کو سمجھایا لیکن ناکام رہے۔آخر کار انہوں نے مجبور ہو کر کوٹری کی سکونت ترک کر دی اور دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔

اس حادثہ سے شاہ کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔انہوں نے گھر بار چھوڑا۔فقیری بھیس میں جنگلوں، پہاڑوں کی راہ لی۔جوگیوں کے سنگ پہاڑوں میں بسیرا کیا۔وہاں سے ٹھٹھہ وارد ہوئے۔مخدوم محمد معین سے دل کی روشنی پا کر گھر لوٹے۔انہیں دنوں دَل قوم کے سرکشوں نے مرزا مغل بیگ کی حویلی پر یلغار کر دی۔گھر کے تمام مرد مار دیئے گئے۔شاہ حبیب نے اپنے مرید کے لٹے پٹے خاندان کو سہارا دیا۔جس سے متاثر ہو کر مرزا مغل کے گھر والے مرزا کی بیٹی سیدہ کی شاہ لطیف سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئے۔ان کی شادی ہو گئی۔یہ اٹھارہوں صدی کے ابتدائی برس تھے۔

پنجاب کے صوفی بزرگ اور اولین پنجابی شاعر بابا فرید گنج شکر شاہ لطیف سے پانچ سو برس قبل تیرھویں صدی میں گزر چکے تھے۔ان کا ماحول مکمل طور پر عربی، فارسی کا ماحول تھا لیکن انہوں نے تیرہویں صدی عیسوی میں پنجابی زبان کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا، شاہ لطیف، بابا فرید کی شخصیت اور شاعری سے کسی حد تک آگاہ تھے۔اس بارے میں تحقیق سے کچھ ثابت نہیں ہے لیکن انہوں نے سندھی زبان کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا، جس سے وضح ہوتا ہے کہ صدیوں پہلے سندھ میں بھی فارسی عربی کی روایت کے باوجود سندھی شاعری کی بنیاد پڑ چکی تھی لیکن یہاں اس بات کا تقابل دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ جس طرح تیرہویں صدی کا پنجاب اندرونی شورشوں اور منگول حملوں کا شکار تھا، اسی طرح شاہ لطیف اور بلھے شاہ کی اٹھارہویں صدی مغل سلطنت کی ٹوٹ پھوٹ اور نادر شاہ ایرانی اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے چور چور تھی۔فرق صرف اتنا تھا کہ پنجابی شاعری کے برعکس شاہ کی شاعری میں اس سیاسی افراتفری کے واضح اشارے نہیں ملتے۔شاہ نے اپنے عہد کی خارجی شورش اور اپنے من کی داخلی کیفیت کو ملا کر وہ گہرائی پیدا کی جس کا

جواب آج تک پورے برِصغیر میں پیدا نہیں ہوسکا۔

پنجاب میں شاہ کے دو ہم عصر شعراء گزرے ہیں، وارث شاہ اور بلھے شاہ= دونوں کے یہاں اٹھارہوں صدی کی افراتفری اور شورش کے واضح اشارے ملتے ہیں کیونکہ وہ دونوں حملوں کے مراکز لاہور اور قصور سے تعلق رکھتے تھے جبکہ شاہ لطیف سندھ میں حملوں کے مراکز سے فاصلے پر تھے اس لئے ان کے کلام میں اس شورش کا واضح اظہار نہیں ملتا۔ اس حوالے سے سبطِ حسن کے خیال میں اس کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان ادوار میں عموماً وہی شہر اور دیہات متاثر ہوتے تھے جو فوجوں کی نقل وحرکت کے راستے میں پڑتے تھے۔ دور افتادہ بستیاں غنیموں کی دست بُرد سے بچی رہتی تھیں۔ لوگوں کی روزمرّہ زندگی میں کوئی خلل نہیں آتا تھا اور نہ عوام کو اس سے دلچسپی ہوتی تھی کہ دہلی کے تخت سے کون اتارا گیا اور کس کے سر پر تاج رکھا گیا۔ بھٹ شاہ کی چھوٹی سی الگ تھلگ بستی کلہوڑوں کے مرکز شکار پور سے سینکڑوں میل دور واقع تھی اس لئے عین ممکن ہے کہ اس بستی نے کلہوڑوں کی طاقت آزمائیوں اور نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے کوئی اثر قبول نہ کیا ہو۔ ورنہ شاہ لطیف کا سا ذہن اور ذکی الحس شاعر جس نے فرنگی سوداگروں تک کا تذکرہ کیا ہے ملکی واقعات کو نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔

جس طرح بابا فرید نے ملتان سے دور ایک ویران پٹن پر ڈیرے ڈال دیئے تھے جو بعد میں پاک پٹن کے نام سے مشہور ہوا، اسی طرح شاہ لطیف نے شادی کے کچھ عرصہ بعد کوٹڑی سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر ایک غیر آباد مقام کو اپنا مسکن بنایا جو بعد میں بھِٹ شاہ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہیں ان کے والد سید حبیب نے ۱۷۳۱ء میں وفات پائی اور اسی مقام پر دفن ہوئے۔ شاہ لطیف نے اس غیر آباد مقام کو مرجع ِخلائق بنا دیا اور ۱۷۵۲ء میں انتقال کے بعد یہیں دفن ہوئے۔

۱۷۰۷ء میں مغل بادشاہ اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو شاہ لطیف صرف سترہ اٹھارہ برس کے تھے۔ سندھ میں کلہوڑا عہد پروان چڑھ رہا تھا۔ مغل صوبے دار یار محمد کلہوڑا کے بیٹے نور محمد نے اپنی جاگیر کو سیوستان اور ٹھٹہ تک بڑھایا۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے حملہ کیا تو سندھی عوام نے نور محمد کلہوڑا کی سربراہی میں ایرانی حملہ آور کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا لیکن وہ شکست سے دوچار ہوئے اور نور محمد کو تاوانِ جنگ کے علاوہ اپنے تینوں بیٹے بطور یرغمال نادر شاہ کے حوالے کرنا پڑے۔ جنہیں وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کا قتل ہوا تو اس کے تینوں بیٹے ایران سے واپس آ گئے۔ نور محمد نے خراج دینا بند کر دیا جس پر احمد شاہ ابدالی نے سندھ پر حملہ کر دیا اور سکھر، بھکر اور شکار پور جیسے اہم سندھی مراکز اپنے قبضے میں کر لیے اس اثناء میں شاہ لطیف ۱۷۵۲ء میں انتقال کر گے۔

شاہ لطیف نے سندھی زبان کو بھرپور انداز میں اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا تھا۔ ان کا تصوف اقتدار کے مراکز اور درباروں سے دور پروان چڑھا۔ یوں بھی سندھو وادی میں تصوف کی تاریخ شہنشاہیت کی نفی کرنے، بیرونی حملوں کے خلاف نفرت کا اظہار کرنے قتل وخونریزی کو ناجائز قرار دینے، مذہبی منافرت سے بلند ہوکر سوچنے اور مظلوم عوام کے حق میں آواز بلند کرنے کی تاریخ ہے۔ اس پس منظر میں شاہ کی شاعری کا انوکھا رنگ ہے۔ وہ ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے ماننے والے تھے۔ ان کی شاعری پر بھگتی کے گہرے اثرات پڑے۔ انہوں نے عشق ومعرفت کے رموز سسّی پنوں، لیلا چینسر، سوہنی مہینوال اور عمر ماروی کے پردے میں بیان کیے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے راگوں کو اپنی شاعری کی بنیاد بنایا۔ ان کی ہر داستان کسی نہ کسی راگ کی بنیاد پر ہے۔ حتیٰ کہ سر سورٹھ تو رائے ڈیاچ اور گائیک بیجل کے حوالے سے موسیقی کی عظمت کا شاہکار ہے شاہ کے وحدت الوجود کی بنیاد سندھ کی دھرتی ہے، سندھ سے ان کا وجودی رشتہ ہے۔ اس تصور کی رو سے کہ کائنات اور تمام انسان، جلوہ خداوندی کے مختلف روپ ہیں، شاہ کی شاعری کا حقیقی جوہر ہے۔ جب کائنات کے ذرے ذرے میں اسی کا وجود پایا جاتا ہے تو مذہب اور رنگ ونسل کے جھگڑے کیا ہیں۔ میں اور تو کا فرق کیوں ہے اسی لیے شاہ کی داستانوں میں یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ کون سے کردار ہندو ہیں اور کون سے مسلمان۔ یہی وسیع المشربی ان کے کلام کی جان ہے۔

ہو گئے، ایک مل کے ذات وصفات
مٹ گیا فرق عاشق ومعشوق
ہم ہی کوتاہ بیں رہے ورنہ
وہی خالق ہے اور وہی مخلوق
غیر محدود ہے جلال اس کا
دہر آئینہ جمال اس کا
روح انساں میں جلوہ فرما ہے
پرتو حُسن بے مثال اس کا
زندگی، موت، سانس، دل کی پھانس
کون جانے ہیں تیرے کتنے نام

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا۔ شاہ لطیف زمان ومکاں سے ماورا ہیں، وہ ہر زمین اور ہر زمانے کے شاعر ہیں۔

اس لئے وہ آج کے بھی شاعر ہیں اور آج کے تمام تقاضوں پر بھی پورے اترتے ہیں۔ اس تناظر میں، چند مثالوں کا ذکر کروں گا، جو آج کے سندھ کی جدو جہد کو شاہ سے جوڑتی ہیں۔ سب سے پہلے میرے پیشِ نظر سر ماروی ہے جو آج کے سندھ کی بغاوت، آزادی اور وطن کی محبت کا سب سے بڑا استعارہ ہے۔ یہ کہانی آپ سب کو ازبر ہے، اس لئے میں اسے نہیں دہراؤں گا۔ اور سر ماروی سے چند اقتباسات پیش کروں گا۔

مجھے پیارے ملیر کی سوگند
جال میں تیرے میں نہ آؤں گی
اے عمر سوگوار آنکھوں سے
یوں ہی آنسو سدا بہاؤں گی
چھوڑ کر ماروؤں کی بستی کو
چین ہرگز یہاں نہ پاؤں گی
مجھ کو سولی ہے تیری سیج نہیں
جان پر اپنی کھیل جاؤں گی

اے عمر تیرا خلعتِ زرتار
میری لوئی کے سامنے بیکار
ریشمی لمس سے نہ کم ہوگا
دل سے ان پیارے ماروؤں کا پیار
اے عمر لاکھ درجہ بہتر ہے
سیم وزر سے مجھے وطن کی خاک

رنگ و روغن تجھے مبارک ہو
مجھ کو پیارے وہی خس و خاشاک

اب یہ منظر دیکھئے

کتنے خوش ہوں گے اے عمر وہ لوگ
رُت ہے برکھا کی آج کل گھر میں
کوئی کاٹے گا، کوئی کاتے گی
اون ہی اون ہو گا ہر گھر میں
کتے خوش ہونگے بُن رہے ہوں گے
نت نئی کملیاں وہ کھائر میں
کہتی ہوں گی ملیر کی سکھیاں
کاش آجائے ماروی گھر میں
اے عمر جھونپڑوں کا وہ سکھ چین
کیا ملے گا محل کے بستر میں

او پھر ماروی پکار اٹھتی ہے

مٹادو یہ درو دیوارِ زنداں
جلا کر خاک کردو قصر و ایوان

اس تناظر میں ماروی سندھ کی روح آزادی کا استعارہ ہے، وہ محبت کے نام پر جبر آمریت اور اقتدار کو دھتکارتی ہے۔ شاہ کے کلام میں عمر سومرو کی طرح جبر اور ہوس کے کئی اور استعارے بھی ملتے ہیں۔ بیجل، چنزو، کونرو، ہمیر سومرو اور ڈم وغیرہ، اس پس منظر سے پیش منظر میں آئیں تو لگتا ہی نہیں کہ شاہ لطیف گزری صدیوں کے شاعر ہیں۔ ان کا کلام آج کے سیاسی سماجی، ثقافتی، لسانی اور اقتصادی، تقاضوں کا جیتا جاگتا اظہار ہے۔ صرف سیاسی پہلو سے دیکھا جائے تو سندھ کی گذشتہ ستر برس کی تاریخ اسی طویل جدوجہد سے عبارت ہے جس سے صدیوں پہلے ماروی کو گزرنا پڑا۔ سندھ کا جرم یہ تھا کہ اس نے سب سے پہلے ۱۹۴۳ء میں سندھ اسمبلی سے قرارداد پاکستان منظور کی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد سندھ کی راجدھانی کراچی کو سندھ سے چھین کر مرکز کا دارالحکومت بنا دیا گیا۔ اس کے خلاف احتجاج ہوا تو سندھ کے وزیر اعلیٰ کو معزول کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی کراچی کو غیر سندھی شہر بنانے کا عمل مہاجروں کی آمد سے ہوا۔ پورے پاکستان کو چھوڑ کر دیدہ دانستہ ان کو کراچی میں آباد کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ مہاجروں کو کراچی اور سندھ کے دوسرے بڑے شہروں میں لا کر بسانا کوئی اتفاق کی بات نہیں تھی بلکہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا جسے پاکستان کے پہلے وزیر اعظم

بڑی سوجھ بوجھ سے آگے بڑھا رہے تھے۔ایک مضبوط اور طاقتور مہاجر مرکز ان کے حلقہء انتخاب کے طور پر ضروری تھا۔کھوکھراپار ایک بند کی طرح ٹوٹ گیا اور سندھی قوم کو اپنی ہی سرزمین پر مہاجر بنانے کے تاریخی عمل کی ابتداء ہو گئی۔جنوری ۱۹۴۸ء میں کراچی کی ہندو اور سکھ آبادی کے خلاف فسادات کروائے گئے اور ان کا قتل عام کیا گیا۔
کراچی سے سندھی زبان کے خاتمے کا عمل بھی ۱۹۴۸ء میں شروع ہو گیا۔سندھی ۱۸۵۰ء سے صوبے کی دفتری اور تعلیمی زبان چلی آرہی تھی۔قیام پاکستان کے بعد سندھی سکولوں کا خاتمہ کر دیا گیا۔۱۹۷۰ء میں انسٹیٹیوٹ آف سندھالوجی کو آگ لگائی گئی۔۱۹۷۲ء میں لسانی فسادات پھوٹ پڑے اور سندھ کو دولسانی صوبہ بنا دیا گیا۔لالوکھیت میں اردو کی قبر بنائی گئی اور سب سے کثیر الاشاعت قومی اخبار نے نعرہ بلند کہا:

اردو کا جنازہ ہے، ذرا دھوم سے نکلے

۱۹۵۴۔۵۵ء میں ون یونٹ کا ڈول ڈالا گیا۔
دولتانہ کی سرکردگی میں پنجاب میں ایک خفیہ دستاویز تیار کی گئی تھی، جس میں لکھا تھا کہ سندھ کی زمینوں، سرحد کی بجلی اور بلوچستان کی معدنیات کو پنجاب کے تصرف میں لانے کی ضرورت ہے۔
سندھ سمیت تمام صوبوں کی شناخت کے ساتھ ساتھ ان کے وسائل پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔سندھ نے ماروی کی طرح اینٹی ون یونٹ محاذ کے جھنڈے تلے پندرہ سال تک جدوجہد کی اور کہیں ۱۹۷۰ء میں جا کر ون یونٹ کا خاتمہ ہوا۔اور یوں سندھ کو اپنے وجود کی پہچان واپس ملی۔۔
سندھ کی زمینوں کی لوٹ مار کا آغاز سکھر بیراج کی زمینوں سے ہوا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ سندھ میں زمین حاصل کرنے والے مہاجروں کی بہت بڑی تعداد غیر حاضر زمینداروں پر مشتمل تھی۔۳۱ جنوری ۱۹۵۷ء کو ضلع سانگھڑ میں ہاریوں کی بے دخلی کے ایک واقعہ کے بارے میں سوال کا جواب دیتے ہوئے مہاجرین کے وزیر سید جمیل حسین رضوی نے کہا تھا کہ ان ہاریوں کی بیدخلی کے احکام اس لئے جاری کئے گئے تھے کہ ان کی زمینوں پر ''مصدقہ کلیموں والے مہاجرین کو بسایا جا سکے اور یہ کہ بے دخل ہاریوں کی آبادکاری کیلئے متبادل زمین مخصوص نہیں کی گئی۔اسی طرح کوٹری بیراج کی زمینوں کی بندر بانٹ میں مہاجروں کے ساتھ ساتھ پنجابیوں اور پٹھانوں کو بھی بڑے پیمانے پر حصہ ملا۔
معاشی استحصال اور سیاسی جبر کا یہ سلسلہ بعد میں بھی چلتا رہا۔ضیاء الحق کے دور میں منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کا عدالتی قتل کیا گیا۔یہ سلسلہ شاہنواز بھٹو، مرتضیٰ بھٹو اور بے نظیر بھٹو کے قتل تک دراز ہوا۔ایم آر ڈی کی تحریک میں

سندھ کا بے دریغ خون بہایا گیا۔اس موقع پر شاہ پھر یاد آئے۔

سارا ملک منصور
ذبح کروگے کتنے؟
یا پھر
سب منصور ہزار
کتنے دار چڑھاؤ گے؟

اس وقت پنجاب سور ہا تھا یا سوچ رہا تھا

جیسے سندھ تحریک، ۴ر مارچ کا طلباء اندولن، جی ایم سید، شیخ ایاز اور جام ساقی کی قید و بند، جنوری ۱۹۵۲ء میں ڈی ایس ایف پر فائرنگ، تھوری کراسنگ، قتل عام، شیریں سومرو کا سانحہ، شاہ کو کہاں کہاں یاد کریں۔

سیاسی حوالے سے یہ تو سندھ کے داخلی مسائل تھے، سامراجیت آج ایک اور بڑا مسئلہ ہے۔شاہ لطیف کے عہد میں مغربی سامراج برِصغیر اور سندھ میں اپنے پنجے گاڑنے کیلئے پر تول رہا تھا۔شاہ کو محسوس ہو گیا کہ فرنگی بھیس بدل کر سندھ میں داخل ہو رہا ہے لیکن حکمران کلی طور پر غافل ہیں۔

ہمارے ناخداؤں کو ہوا کیا
بدل کر بھیس آئے ہیں فرنگی
بتاؤ ہے کوئی ملاح ایسا
کہ روکے یورشِ دزدانہ ان کی

آج بھی یہ سوال کہ انہیں روکنے کیلئے کیا کوئی ملاّح، کوئی ناخدا موجود ہے، جو آنے والے سامراجیوں کا راستہ روکے؟ مذہبی انتہا پسندی، سامراجیت کا ایک اور کھیل ہے جو شاہ لطیف بھٹائی کی تعلیمات کے منافی ہے۔ہم گذشتہ تیس برس سے جہادی عفریت کا شکار ہیں۔

رواداری، صلح کل، برداشت جیسی انسانی قدروں کو بھول کر ہم محض ایک مذہب کی برتری کے سحر میں گم ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ ہم پرائی جنگ کا ایندھن بن رہے اور سامراجی عزائم کو پورا کر رہے ہیں۔

شاہ لطیف نے زمین اور زمین والوں سے جس وابستگی کا درس دیا تھا، اسے ہم نے وابستگیوں اور تہذیبوں کے تصادم

میں بدل دیا ہے۔ اس وقت سندھ سمیت ہمارا پورا دیس دہشت گردی کی جس آگ میں جل رہا ہے، وہ شاہ بھٹائی کی تعلیمات سے منہ موڑنے کی وجہ سے ہے۔ اپنے ایک مضمون ''شاہ عبداللطیف کی شاعری'' میں سبطِ حسن اس بات کا تجزیہ کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ:

''زمین اور زمین والوں سے وابستگی کا جو تصور شاہ لطیف نے پیش کیا اس سے پیار اور محبت کے سوتے پھوٹتے تھے لیکن وابستگی کے جس تصور پر ان دنوں زور دیا جا رہا ہے اس سے نفرت، عداوت اور بدگمانی کی چنگاریاں نکلتی ہیں۔ مثلاً ایک گروہ کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص سندھ یا پنجاب یا سرحد یا بلوچستان سے وابستگی کا اقرار کرتا ہے یا ان علاقوں کی زبان اور تہذیب سے محبت کا اعلان کرتا ہے یا وادیٔ گنگ وجمن کی تہذیب اور زبان سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے تو پھر پاکستان سے اس کی وفاداری مشکوک ہے۔ وہ نظریہ پاکستان کی نفی کرتا ہے۔ (یہی وہ ذہنیت ہے جس کے کرتوتوں سے پاکستان کا اکثریتی صوبہ پاکستان سے الگ ہوگیا۔

وہ اس بحث کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے وابستگی کے دائروں کو ٹکراؤ کی بجائے تنوع کی ہم آہنگی کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔

''طرزِ عمل اور طرزِ فکر واحساس کا یہ انداز شاہ لطیف کی تعلیمات سے کوئی میل نہیں رکھتا۔ شاہ لطیف کے ذہن میں وابستگی یا وفاداری کے دائرے تو ہیں لیکن ان کی وفاداری الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ مثلاً وابستگی کا ایک وہ دائرہ ہے جو فقط خاندان والوں تک محدود ہوتا ہے، دوسرا دائرہ وہ ہے جس میں ہم کام کرتے ہیں یا روزی کماتے ہیں، تیسرا دائرہ محلّہ داروں یا گاؤں والوں کا ہے۔ چوتھا دائرہ اس خطے کا یا علاقے کا ہے جس میں آپ آباد ہیں۔ پانچواں دائرہ پورے ملک پر محیط ہے۔ اور چھٹا دائرہ پوری دنیا کو اپنے حلقے میں لے لیتا ہے۔ ان کے علاوہ اور دائرے بھی بنتے ہیں مثلاً آپ کے ہم خیالوں کا حلقہ جس سیاسی، تہذیبی یا ادبی جماعت سے آپ وابستہ ہوں اس کا حلقہ، غرضیکہ ہر انسان بے شمار حلقوں سے وابستہ ہوتا ہے مگر ایک حلقے سے وابستگی دوسرے تمام حلقوں کی وابستگی کی نفی نہیں کرتی۔ وابستگی کی سطحیں الگ الگ ہوسکتی ہیں لیکن ان میں ٹکراؤ ضروری نہیں۔ رہ گئی وابستگی کی شدت سو اس کا انحصار انسان کے ذاتی تجربات، جذبات اور احساسات پر ہوگا۔

ان دائروں میں ایک دوسرے سے کہیں ٹکراؤ یا تصادم نہیں ہے بلکہ یہ دائرے انسانی رشتوں کا اثبات کرتے ہیں۔ اس ملک میں ایک دائرہ مختلف مذاہب کا دائرہ بھی ہے سندھ کا معاشرہ یا شاہ کی شاعری اس کی بہترین مثال ہے۔ مثلاً ہم ہندو بھی ہیں، مسلمان بھی، پارسی بھی ہیں، بہائی بھی، مسیحی بھی ہیں اور مختصر جماعت یہودیت کو ماننے والوں کی بھی

ہے۔ یہاں سکھ بھی بستے ہیں اور بدھ مت سے تعلق رکھنے والے ملکی یا غیر ملکی آبادی کے لوگ بھی ہیں ۔۔اس ملک کے بانی محمد علی جناح نے ان مذہبی دائروں میں آزادی سے زندگی بسر کرنے کی نوید سنائی ۔قائداعظم نے غالباً شاہ لطیف بھٹائی کو نہیں پڑھ رکھا ہوگا۔لیکن انہوں نے ہر فرد کیلئے مذہبی آزادی کا جو اعلان کیا۔وہ شاہ لطیف کی تعلیمات کے عین مطابق تھا۔میں اپنی بات مرحوم آغا تاج محمد کے اس چونکا دینے والے قول پر ختم کرتا ہوں:

’’دنیا جوں جوں پرانی ہوتی جا رہی ہے اور سندھی زبان اپنی منزلوں سے گزر کر نئے سانچوں میں ڈھل رہی ہے اسی اعتبار سے شاہ صاحب کا کلام بھی روزمرہ،زندہ ءجاوید ہوتا چلا جا رہا ہے۔‘‘

محمدی بیگم کے ناولوں میں خواتین کے معاشرتی رویوں کی عکاسی

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

انیسویں صدی سیاسی اور سماجی حوالوں سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔نوآبادیاتی ہندوستان میں کئی پرانی قدروں کی شکست اور نئی قدروں کی بازیافت جاری تھی۔قدیم اور جدید کی اس کشمکش نے کئی بحثوں کو فروغ دیا جن میں جدید تعلیم کا حصول ایک ایسا مسئلہ بن کر سامنے آیا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو دو دھڑوں میں تقسیم کر دیا۔ایک طبقہ جو جدید تعلیم کا حصول چاہتا تھا، اسے انگریزوں کا وفادار کہہ کر کفر کے فتوے لگائے گئے جبکہ دوسرا طبقہ سرے سے انگریز یا انگریزی تعلیم کو ہندوستان میں دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔اس تمام بحث میں جدید خیالات رکھنے والا ہو یا کٹر روایت پسند خواتین کے لیے رسمی تعلیم کی مذمت کرنے کے حوالے سے دونوں طبقات بلاشبہ متفق تھے۔یہاں تک کہ جدید تعلیم کے لیے دن رات کوششیں کرنے والے اور جدید طرزِ فکر کے حامی سر سید احمد خان بھی خواتین کی رسمی تعلیم کے حق میں نہ تھے۔وہ خواتین کے لیے گھر کے اندر ابتدائی سطح کی تعلیم کو کافی سمجھتے تھے۔

ان کا ایک خطاب جو انھوں نے خواتینِ پنجاب سے کیا ان کے خیالات کا بہترین عکاس ہے(۱)۔اسی نظامِ فکر کے تحت ان کے ساتھیوں نے بھی عورت کے حقوق کی گھر کے اندر فراہمی کے حق میں آواز تو اٹھائی لیکن اسے گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر معاشرے میں کوئی تعمیری کردار ادا کرنے کی سخت مخالفت کی۔شیخ عبداللہ سر سید احمد خان کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے وہ اس اختلافی صورتِ حال کے حوالے سے ایک یادداشت کو یوں قلم بند کرتے ہیں:

> ''صاحب زادہ آفتاب احمد خان صاحب وانوں نے اس مسئلہ پر تقریر کی لیکن
> پرانی تعلیم کے مسلمان کچھ اس طرف متوجہ نہ ہوئے۔لیکن نواب محسن الملک
> مرحوم اس تحریک کے موافق تھے۔سر سید اور ان کے دیگر احباب اس کے مخالف

تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب خواجہ صاحب سرسید سے ملنے گئے تو سرسید نے ان کی تعلیم نسواں کی حمایت کا مضحکہ اڑایا۔ اور ابھی وہ کمرے میں گھسنے بھی نہ پائے تھے، کہا کہ کیا تم پردے سے باہر نکل آئے ہو۔ مجھے یاد ہے کہ کسی موقع پر اس زمانے میں، میں نے بھی سرسید سے عرض کیا کہ لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام ضروری ہے۔ سرسید نے فرمایا کہ موجودہ طرز کے مدارس میں پڑھ کر لڑکیاں بداخلاق ہو جائیں گی اور ان کے دوست شمس العلماء حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب دہلوی جو اس وقت ان کے پاس بیٹھے تھے کہا کہ میاں کیا تم لڑکیوں کے لیے مدرسہ قائم کرنا چاہتے ہو، انگریزی مدارس میں پڑھ کر ہڑدنگیاں ہو جائیں گی۔(۲)

روایت پسند طبقے نے خواتین کے لیے رسمی تعلیم کو مغربی تہذیب کی یلغار قرار دیتے ہوئے اسے مشرقی اقدار سے بغاوت قرار دیا۔ تعلیم کے حصول میں پردے کا حد سے بڑھا ہوا رجحان بھی ایک وجہ تھی جس سے باقاعدہ تعلیم کے لیے گھر سے نکلنا بطورِ خاص اشرافیہ کی خواتین کے لیے زیادہ معیوب سمجھا جا تا تھا۔ اگرچہ جے ای ۔ڈی بیتھون (J.E.D Bethune,1801-1891)(۳) کی کوششوں سے لڑکیوں کے سکولوں کے لیے فنڈ زفراہم کیے گئے لیکن مسلم خاندان جنگِ آزادی کی وجہ سے ان سکولوں کو ناپسند کرتے تھے اور انہیں خوف تھا کہ دیگر مذاہب کی لڑکیوں سے ان کا میل ملاپ ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلم گھرانوں کی لڑکیاں ان سکولوں سے فیض حاصل نہ کرسکیں۔ پھر ایک اور توجیہہ جو لڑکیوں کے لیے بطور عذر پیش کی جاتی تھی کہ یہ لکھنا جان لیں گی تو نامحرموں کو خط لکھیں گی۔ اس طرح کے اوہام نے مسلم گھرانوں میں باقاعدہ تعلیم کے لیے کئی طرح کی رکاوٹیں پیدا کر دی گئی تھیں۔ یہی وہ رویے تھے جو خواتین کی تعلیم کے راستے میں مزاحم تھے۔

Women's Education in the nineteenth century was the result of the modernising effects of British colonialism and the rise of reform movements both among Hindus and Muslims....This late begining of such a movement and its slow progress during three first quarter of the twentith century,was to a very great degree the result of the presisting traditionalist

> attitude among the common people as well as the elite groups as a dominant trend,which tended to perpetuate the social constraints from which Muslim women suffered.In other words ,Muslim conservatism was responsible for the unsatisfactory educational status of Muslim women.(4)

نوآبادیاتی ہندوستان میں جدیدیت کی لہر کسی نہ کسی حد تک عوام وخواص پر اپنے اثرات مرتب کر رہی تھی۔کئی باشعور افراد ہندوستانی معاشرے کے دوہرے معیارِ زندگی کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔وہ دیکھ رہے تھے کہ کس طرح مذہب کو آڑ بناتے ہوئے خواتین کے حقوق کی پامالی کی جا رہی ہے جن میں علم حاصل کرنے کا حق بھی شامل ہے۔اس ضمن میں مولوی ممتاز علی کی کاوشیں قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے بیسویں صدی کے آغاز سے بھی قبل خواتین کے حقوق کے لیے باقاعدہ آواز اٹھائی۔ان کی کتاب ''حقوقِ نسواں'' خواتین کے ساتھ جوڑی گئی توہمات کو قرآن وحدیث کی روشنی میں رد کرتی ہے۔یہ کتاب سر سید احمد خان کو قبل از وقت ایک کوشش لگی اور انہوں نے مسودہ دکھانے پر مولوی ممتاز علی پر خفگی کا اظہار کیا۔یہ کتاب سر سید احمد خان کے انتقال کے بعد مولوی ممتاز علی نے ۱۸۹۸ء میں دارالاشاعت لاہور سے شائع کی۔(۵) اسی سال خواتین کے لیے شائع ہونے والا مجلّہ ''تہذیب النسواں'' (۶) بھی منظر عام پر آیا جو ان کی اہلیہ محمدی بیگم نے جاری کیا۔مولوی ممتاز علی اور محمدی بیگم خواتین کے ساتھ ہونے والے استحصال پر خاموش نہ رہ سکے اور انہوں نے قلم کے ذریعے خواتین کے حقوق کی جنگ لڑی۔یہ دونوں اہلِ دانش اپنے اردگرد کے معاشرتی رویوں کو جانتے تھے،اور اس ردِعمل کی بھی یقیناً توقع رکھتے ہوں گے جو انہیں اپنے معاصرین کی طرف سے پیش آیا۔لیکن اس سب کے باوجود انہوں نے اس جامد نظامِ زندگی میں تحرک پیدا کی اور عام روایتی طریقوں سے ہٹ کر محمدی بیگم اپنے نام کے پردے سے بغاوت کرتے ہوئے اردو ادب کے منظر نامے پر جلوہ گر ہوئیں۔جبکہ اس وقت خواتین کے ناموں کا اخفاء بھی شرفاء میں عام تھا جیسا کہ 'ز۔خ۔ش' یا بنت لبا قر یا امت الوحی وغیرہ۔آج کے دور کی مناسبت سے کسی خاتون کا اس کے اپنے نام سے لکھنا ایک عام بات ہو لیکن انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے اوائل عشروں میں یہ ایک بڑا اقدم تھا۔

> '''اس زمانہ میں خواتین کا پڑھنا لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور مسلم معاشرے کی ایک روایت یہ تھی کہ شریف زادیاں اپنا نام نہیں ظاہر کرتی تھیں۔اس لیے پٹنہ

صوبہ بہار کی اس خاتون نے بھی ''اصلاح النساء'' اپنا تعارف اصل نام کی بجائے یوں کرایا تھا ''والدہ محمد سلیمان بنت سید وحید الدین خان و ہمشیرہ سید امداد امام اثر'' (۷)

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں محمدی بیگم کے تخلیقی سفر کا آغاز بلاشبہ خواتین کے تشخص میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر چہ انہیں اس کی بھاری قیمت چکانا پڑی۔ انہیں اور ان کے شوہر مولوی ممتاز علی کو ایسے خط بھی ملے جن میں فحش گالیاں درج ہوتی تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کے گھر کے درو دیوار کو بھی اسی قسم کی مغلظات سے آلودہ کیا جاتا تھا۔ لاہور کے چند کٹر روایت پسند بزرگوں نے ایک طوائف ''اللہ دی نزاکت'' نامی سے ایک زنانہ اخبار جاری کروایا جس سے ''تہذیب نسواں'' کی تضحیک کا پہلو نکلتا تھا۔ مولوی ممتاز علی کا ایک واقعہ محمد اسماعیل پانی پتی ان کی زبانی یوں درج کرتے ہیں۔

> ''ایک مرتبہ ایک مقامی اخبار نے بڑے طنز کے ساتھ لکھا کہ ''انگریزوں کے راج کی برکت ہے کہ تعلیم روز بروز عام ہو رہی ہے اور تصنیفات اور اخبارات کو ترقی ہے ۔۔۔۔ اخبار ابھی تک (صرف) مردوں تک محدود تھے۔ مگر اب عورتوں کے اخبار بھی جاری ہونے لگے ہیں۔ چنانچہ دو شریف زادیوں ''اللہ دی نزاکت'' اور ''محمدی بیگم'' نے اس ''نیک'' کام کی طرف توجہ کی ہے۔ میری اہلیہ کو اس بات سے کہ میرا نام ایک کسبی کے ساتھ ملا کر ایک ہی سطر میں لکھا گیا ہے، بے انتہا صدمہ ہوا اور وہ بہت دیر تک روتی رہیں۔'' (۸)

(شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، تاج صاحب کے والدین''، مشمولہ مجلّہ ''صحیفہ''، تاج نمبر، شمارہ ۵۳، اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص نمبر ۲۵)

محمدی بیگم نے صرف انیس سال کی عمر میں ''تہذیب النسواں'' کی ادارت سنبھالی مگر آخری سانس تک اسی جذبے سے جاری رکھا جس کے تحت انہوں نے یہ جریدہ خواتین کی ذہنی تربیت اور ان کے لیے اصلاح و ترقی کی غرض سے شروع کیا تھا۔ پہلی خاتون مدیر کی حیثیت سے انیسویں اور بیسویں صدی کی صحافت میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ (۹)

محمدی بیگم پر الگ سے کوئی تحقیقی یا تنقیدی کام سامنے نہیں آیا۔ اس دور کے متعلق جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں وہ محمدی بیگم اور تہذیبِ نسواں کے ذکر کے بغیر نامکمل ہیں۔ مستشرقین نے بھی کئی حوالوں سے اس دور کی خواتین کی ذہنی

صلاحیتوں کا اقرار کرتے ہوئے بڑے اہم کام کیے ہیں جن میں گیل مینو (Gail Minaualt) کی کتاب The SecludedScholars قابلِ ذکر ہے۔ وہ محمدی بیگم اوران کے دور کے متعلق لکھتی ہیں کہ:

> "The content of Muhammadi Begum's writings reflected the content of Tehzib-un-Niswan during its first ten years under her editorship.The bulk of the articles in Tehzib were aimed at the Purdah-observing woman at home,focusing on her need for broadened horizons through the medium of this publications.Articles disscussed and child care,gave education,housekeeping recipes,.....A costant theme was the reform and simplification of custom and the need to eliminate wasteful expenditure on rituals and ornaments,a refrain in the work of other reformers including her husband."(10)

انور شاہین کا تحقیقی مقالہ(Patriarchal Education and Print Journalism: their emancipating impact on Muslim Women India during 1869-1908) (11)،عذرا اصغر علی کے مقالے(The emergence of Reformist Literature about Indian Muslim Women (in Urdu Language) میں بھی نو آبادیاتی عہد میں خواتین کی صورتِ حال کا بہت گہرائی سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ (12)سی ایم نعیم اپنے مضمون " Meet Bibi Ashraf" میں محمدی بیگم کی تحریر کردہ سوانح ''حیات اشرف'' کے مرکزی کردار بی بی اشرف کو تحقیق کی روشنی میں دیکھتے ہیں(۱۳)۔ رؤف پاریکھ کے مضمون '' Literary Notes: Muhammadi and Tehzeeb i- Niswan میں محمدی بیگم کی تصانیف کا مختصر تعارف اور ان کی صحافتی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔(۱۴) اگر چہ اردو ادب اور اردو صحافت کے فروغ میں خواتین کا حصہ اپنے معیار اور مقدار دونوں حوالوں سے قابلِ ذکر ہے۔ لیکن ایک افسوس ناک امر یہ ہے کہ مردوں کی ادبی خدمات پر جس قدر تصانیف کا انبار ملتا ہے خواتین

کا ذکر اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔حتیٰ کہ اردو ادب کی لکھی گئی تواریخ بھی اس حوالے سے تشنگی کا شکار ہیں۔محمدی بیگم پر ایک اور مقالہ بعنوان ''محمدی بیگم کی علمی اور ادبی تصانیف کا تحقیقی جائزہ''مجلّہ ''خیابان''میں شائع ہوا۔مقالہ نگار ڈاکٹر ریحانہ کوثر نے بڑی تفصیل سے محمدی بیگم پر ہونے والے کاموں کا تجزیہ کیا ہے لیکن ان کی تصانیف کے بنیادی حوالوں کی کمی کو بجا طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔مندرجہ بالا پس منظری مطالعے کی روشنی میں اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ محمدی بیگم کے ناولوں کو اس دور کے معاشرتی تناظر میں رکھ کر پرکھا جائے تو شمالی ہندوستان میں بسنے والی خواتین ان کا طرزِ زندگی،ان کے مسائل اور اس دور کی خواتین کا اسلوبِ بیان پوری طرح متشکل ہو جاتا ہے۔

محمدی بیگم ایک تخلیقی اور علمی استعداد رکھنے والی خاتون تھیں،صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنی ہم جنسوں کے مسائل دیکھ دیکھ کر کڑھتی تھیں،ان کے خیال میں یہ مسائل صرف مردوں یا معاشرے کے پیدا کردہ نہ تھے بلکہ وہ ایک گہرے مشاہدے اور تجزیے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی تھیں کہ اگر خواتین خود اپنی کاوش سے اپنی ذہنی اور علمی تربیت کریں تو بہت سے مسائل سے بچ سکتی ہیں۔وہ ان خواتین کو جو کسی وجہ سے خود کو معاشی ضرورتوں کے لیے مرد کا محتاج سمجھتی تھیں ان کو گھر کی چار دیواری کے اندر بیٹھ کر ذریعۂ معاش پیدا کرنے کا درس بھی دیتی ہیں۔وہ صرف غم کی تصویر بنے حالات کے آگے سرنگوں ہونے کی بات نہیں کرتیں بلکہ انہیں تلقین کرتی ہیں کہ گھر کے معاشی معاملات میں بھی اپنا کردار ادا کریں تاکہ مرد اور عورت مل کر زندگی کی گاڑی کو بہتر انداز میں چلا سکیں۔اس کی ایک جھلک محمدی بیگم کی تحریر کردہ سوانح عمری ''حیاتِ اشرف''میں دیکھی جا سکتی ہے۔(۱۵)

ان کا مقصد معاشرے کو بی بی اشرف جیسی روشن مثالوں سے روشناس کرانا تھا جنہوں نے نہ صرف نامساعد حالات میں تعلیم حاصل کرنے کا سفر جاری رکھا بلکہ جب بیوگی کا دکھ جھیلنا پڑا تو استانی کے فرائض ادا کرتے ہوئے دو یتیم بچیوں کے ساتھ عزت اور وقار کی زندگی بسر کی۔ساتھ ہی اس بات کا بھی بار بار ذکر ملتا ہے کہ اشرف بی بی پردے اور اسلامی تعلیمات کی کس قدر پاسدار تھیں۔گویا وہ خواتین کے لیے ان کی زندگی کو ایک ایسا نمونہ بنا کر پیش کرتی ہیں جن کے ذریعے دین اور دنیا کا سفر بآسانی طے کیا جا سکتا ہے۔محمدی بیگم نے جہاں بطور سوانح نگار،مضمون نگار،ناول نگار کے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا،وہیں انہوں نے بچوں کے لیے نظمیں(۱۶)اور خواتین کے میل جول کے آداب (۱۷)اور امورِ خانہ داری(۱۸) سے متعلق کئی کتابیں لکھیں،ان کے کئی مضامین دیگر معاصر جرائد میں شائع ہوتے رہے۔

ان کی تحریروں میں اس وقت کا معاشرہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔اس وقت کے

معاشرے میں تین تہذیبیں اپنے بھرپور اظہار کے ساتھ اپنی اپنی شناخت کے اثرات لیے ہندوستانی معاشرے میں متوازی چل رہی تھیں۔کبھی ایک تہذیب دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرتی اور کبھی دوسری تیسری تہذیب کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیتی۔ابتدائی ناول نگاروں بالخصوص نذیر احمد کے ناولوں میں شناخت کا یہ مسئلہ پوری کشمکش کے ساتھ پیش کیا گیا۔جب مولوی صاحب کے کردار صفحات در صفحات ان کے وعظ و نصیحت کا بوجھ اٹھائے مشرق کی بڑائی اور مغربی تہذیب کے مضر اثرات پیش کرتے ہیں تو ان کے ناولوں کا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔جبکہ محمدی بیگم کے ناولوں میں معاشرتی رویوں کی عکاسی بڑی وضاحت سے کی گئی ہے لیکن کہیں پر بھی نظریاتی کشمکش تصادم کی شکل اختیار نہیں کرتی۔

انگریزی تہذیب کے اثرات انیسویں صدی کے اوائل میں ہی مزاحمت کے باوجود گھروں میں پہنچنے لگے تھے۔جس میں بول چال کے ساتھ ساتھ رہن سہن کا طرز، روّیے اور عام استعمال کی اشیاء سب میں یہ نفوذ بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔''صفیہ بیگم'' میں تہذیب کو براہ راست تو موضوع نہیں بنایا گیا اور نہ ہی کسی دوسری تہذیب پر سبقت یا بڑائی دکھانا مقصود ہے۔ بلکہ اس ناول میں مرکزی کرداروں کے مکالمے، ناول کی فضا اور اسلام کے حوالے سے جدید اور قدیم تصورات کا تجزیہ کرتے ہوئے انگریزی تہذیب کے اثرات کو کہانی کے اندر بڑی نفاست سے پیش کرتے ہیں۔

جب صفیہ تصویر بنانے لگتی ہے تو اسے ماں کی طرف سے شدید ردِعمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

''ہسپتال کی مس تصویر بنانی بھی جانتی تھیں۔انھوں نے اس کو بھی تصویروں کا شوق لگا دیا۔اب دیکھو تو بیسیوں تصویریں اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہیں۔اپنے گھر والوں کی اور اپنی سہیلیوں کی سب کی تصویریں اتار رکھی ہیں۔جو تصویر پسند آئے گی اس کی تصویر اتار کر رکھ لے گی۔بہتیرا کہتی ہوں کہ صفیہ سب ہی کام کرنا مگر یہ بت پرستی مجھے نہیں بھاتی ان بتوں میں جان کہاں سے ڈالو گی؟ بیوی وہ مجھ سے بحث کرتی ہے اور جانے کیا کیا حدیثیں بتا کر کہتی ہے کہ وہ اور تصویریں ہیں جن کا بنانا گناہ ہے''(۱۹)

ناول میں پیش کی گئی منظر کشی میں بھی انگریزی آرائش و زیبائش سے متعلق اشیاء کا ذکر اس دور کے طرزِ زندگی کا مظہر ہے مثلاً صفیہ کے کمرے کا منظر کچھ یوں پیش کیا گیا ہے۔''دوسری میز پر سلائی کی مشین اور چند خوبصورت

انگریزی بیلیں جوصفیہ نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھیں'' (۲۰) صفیہ کے کمرے کی تعریف کرتے ہوئے مغلانی کہتی ہے:
''تمہارا کمرہ انگریزی وضع کا ہے'' (۲۱)

محمدی بیگم نے تین ناول تحریر کیے۔ جن میں ''شریف بیٹی''،''صفیہ بیگم''،'' اور'' آجکل'' شامل ہیں (۲۲)۔ ان کے ناولوں کو دیگر خواتین ناول نگاروں سے اپنے طرزِ بیان اور طرزِ فکر کے اعتبار سے منفرد مقام حاصل ہے۔ اولین لکھنے والی خواتین ناول نگاروں کے فن اور فکر پر مولوی نذیر احمد کے اثرات کی جھلک واضح دکھائی دیتی ہے لیکن انہوں نے اپنی طرز خود ایجاد کی۔ جس میں فنی اور فکری حوالوں سے ایک مختلف اور تجزیاتی طرز فکر نظر آتا ہے جبکہ کئی خواتین ناول نگار اصلاحی نقطہ نظر کے تحت جذباتیت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جبکہ ان کے ناول کسی بھی واقعے کو غیر منطقی انداز میں یا غیر حقیقی رنگ میں پیش نہیں کرتے۔ ان کے کردار بھی مثالیت کا شکار نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنی خوبیوں اور خامیوں سمیت ناول میں متشکل ہوتے ہیں۔ اس طرح ان کے ناولوں کا پلاٹ علت و معلول کے ساتھ جڑا کہانی کے انجام تک پہنچتا ہے جس سے کہیں بھی قاری چونکنے یا غیر یقینی صورتِ حال کا شکار ہونے سے بچ جاتا ہے۔ یوں کہانی میں حقیقت نگاری کا رنگ غالب آ جاتا ہے۔

محمدی بیگم کا ناول ''صفیہ بیگم'' ۱۹۰۳ء میں دارالاشاعت پنجاب، لاہور سے شائع ہوا۔ اس ناول میں بے جوڑ شادیوں اور بچپن کی منگنی جیسی قبیح رسم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ رویہ بھی ابتدائی بیسویں صدی کے معاشرے میں عام تھا کہ لڑکی گھر سے باہر نہ جائے اور قریبی رشتہ داروں میں ہی اس کی بچپن سے ہی منگنی ٹھہرا دی جاتی تھی۔ اس رویے کی نشاندہی یوں تو اس دور کے سبھی ناول نگاروں نے کی ہے لیکن رتن ناتھ سرشار کا ناول ''بدرالنساء کی مصیبتیں'' اس موضوع کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ''صفیہ بیگم'' کا پلاٹ بھی ایک ایسی لڑکی کے خط کے ذریعے اس کی بدنصیبی کی داستان سناتا ہے جس میں وہ والدین کے غلط فیصلوں کے خلاف مزاحمت کی جرأت نہیں کرتی اور اسی کشمکش میں بالآخر موت سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ اور ایک خط بطور وصیت چھوڑتی ہے۔ جس میں التجا کرتی ہے کہ:

> تم اپنی اولاد کے بیاہ شادی میں جان توڑ کر چھان بین کرو۔ یہ چھان بین جس طرح ذات اور نسب کی کی جاتی ہے۔ اس طرح علم کی صحت جسمانی کی، عادات کی، چال چلن کی، مزاج کی، کیفیت کی، اخلاق کی اور سب سے زیادہ لڑکی کی رضامندی کی کی جائے۔'' (۲۳)

اسی طرح لڑکیوں کی شادی کے حوالے سے معاشرے کے عمومی رویے اور اشتہار برائے رشتہ کا رواج بھی اس ناول کی

بعض سطروں سے واضح ہوتا ہے۔ مثلاً

بیوی: تو آخراب میں کیا کروں؟ میں تو جانوں، تہذیب نسواں میں اشتہار۔ کوئی نہ کوئی لڑکا تو مل ہی جائے گا۔ یہ اخبار عموماً بڑے بڑے معزز گھرانوں اور تعلیم یافتہ خاندانوں میں جاتا ہے، جو دیکھتا ہے یہی کہتا ہے کہ جوان بیٹی بٹھا رکھی ہے۔

میاں: ''بٹھا رکھی ہے، تو کیا کسی کے سر پر بٹھا رکھی ہے؟ لوگ کہتے ہیں تو بکا کریں۔ اب ہم لوگوں کے کہے سے ڈر کر اسے کسی اندھے کنوئیں میں تھوڑا دھکیل دیں گے'' (۲۴)

صفیہ کی شکل میں محمدی بیگم اس دور کی تمام مظلوم لڑکیوں کا دکھ پیش کرتی ہیں جن کو شادی میں رضامندی کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ وہ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود ماں باپ کے غلط فیصلے کے آگے سر نہیں اٹھاتی۔

''یہ میرے دل کی کمزوری ہے اور اپنی بری بھلی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ میں اس وقت اپنی جان سے ہاتھ دھوئے بیٹھی ہوں۔ کاش میں سخت دل محض جاہل ان پڑھ لڑکی ہوتی۔ میں نے علم حاصل نہ کیا ہوتا۔ خدا اور رسول ﷺ کے احکام نہ پڑھے ہوتے۔ کیوں کہ اگر مجھے علم نہ ہوتا تو مجھے یہ خوف بھی پیدا نہ ہوتا کہ ناموافق شوہر کے حقوق خدمت ادا نہ ہونے سے میں گنہگار ہوں گی یا اس برائے نام شادی کا بعد میں جو انجام ہوگا اسے میں کس طرح کاٹوں گی۔ اگر میں جاہل مطلق ہوتی تو مجھے اونچ نیچ کا مطلق خیال نہ ہوتا اور اس واقعہ کے پیش آنے سے ذرا ملال نہ ہوتا یا اگر ہوتا تو اسقدر کہ میری آرزوئیں مرجاتیں نہ کہ میں خود ہی مرجاتی۔ میں خوش ہوں کہ میں اس دنیا سے جانے والی ہوں'' (۲۵)

مولوی ممتاز علی نے ''حقوقِ نسواں'' اور ''اربعین'' میں اس مسئلے کو اسلامی حوالے سے دیکھا ہے۔ (۲۶) کسی بھی جگہ لڑکی نسبت ٹھہرادی جاتی تھی اور یہ سوچے بغیر کہ یہ بچہ کل کو کیا نکلے گا، وہ فرشتہ ہوگا یا شیطان یہ دیکھے بغیر بس زبان دے دی جاتی تھی اور پھر اس زبان کا بھرم رکھنے یا قول کا پاس رکھنے کے لیے بیٹیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح کسی کے بھی ساتھ ڈولی میں بٹھا دیا جاتا تھا۔ یہی صورتِ حال ''صفیہ بیگم'' میں بھی پیش آتی ہے کہ اس کو نکاح کے مقررہ وقت تک معلوم

نہیں ہے کہ وہ کس کے ساتھ شادی کے بندھن میں باندھی جارہی ہے۔اس کی دوست اپنی حیرت کا اظہار یوں کرتی ہے کہ ''خوب بیاہ شادی ہے۔خیر سے دلہن کو یہ بھی خبرنہیں کہ بیاہ کس سے ہے۔'' (۲۷)

صفیہ کی ماں اور باپ کے درمیان ہونے والے مکالمے بھی اس دور کے اس قسم کے رویوں کی عکاسی کرتے ہیں جن میں اولاد کومحض ایک قول کی بھینٹ چڑھادیا جاتا تھا:

> صفیہ کا باپ: ''کیوں میں نے پہلی ہی عید پرتمہیں روکا تھا یانہیں؟ کہ تم اس قسم کے لین دین مت رکھو، جب لڑکا لڑکی جوان ہوں گے تب دیکھا جائے گا'' صفیہ کی ماں: ''میری تو جان جائے گی پر آن نہ جائے گی۔ایک دفعہ زبان دے چکی ہوں۔اب چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے، چاہے اس بچی کا نیک نصیبا ہو، چاہے تیرے، چاہے ڈوبے۔دوں گی تو صفدر کو ہی بیٹی دوں گی'' (۲۸)

اس ناول میں جہاں مرکزی موضوع قاری کو پوری طرح گرفت میں لے لیتا ہے وہیں ذیلی عنوانات میں بھی بین السطور بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں خواتین کے رویوں اور ان کے مسائل کی جھلکیاں باآسانی دیکھی جاسکتی ہیں۔مثلاً

> ''تم اپنی والدہ سمیت ان کے ہاں ہوآؤ'' (۲۹)
>
> ''شرم کی کیا بات ہےتمہاری اماں جوساتھ ہوں گی، باتیں وغیرہ تو وہ کریں گی تم حال دیکھ لینا'' (۳۰)
>
> ''اگر نہ جانے دوں تو کتنا برامانیں اور جو جانے دیتی ہوں تو یہ اور نیا ڈھنگ ہے کہ کنواری بیٹی اور بیگانے گھر جائے۔صفیہ تو نے ڈبودیا، میں تو کہیں کی نہ رہی'' (۳۱)
>
> ''بواتم اپنی امی جان کو شوق سے بلالو وہ میری بزرگ ہیں، مجھے ان سے کوئی پردہ نہیں۔'' (۳۲)
>
> ''عورتیں ایسی وہمی ہیں کہ وہ لیڈی ڈاکٹر کو بلانے نہیں دیتیں'' (۳۳)

انیسویں اور بیسویں صدی میں خواتین کے لیے پردے کی پابندی عام تھی اور بطورِخاص شرفاء کی خواتین کے لیے پردہ صرف اسلامی روایت کا حصہ نہیں تھا بلکہ اس دور کا طبقاتی امتیاز بھی تھا۔ایسے حالات میں عورت کا گھر سے نکل کر کمانا ناممکن نظر آتا تھا البتہ نچلے طبقے کی خواتین گھریلو ملازمائیں یا نائینیں وغیرہ چھوٹے چھوٹے اسباب پیدا کر کے کھا کما لیتی تھیں (جس کی نمائندگی ''شریف بیٹی'' میں ''بوڑھی نائین'' کی شکل میں ملتی ہے) لیکن اعلیٰ اور متوسط طبقہ کی خواتین حالات کی مجبوری کے باوجود معاشی کردار ادا کرنے سے قاصر تھیں (جیسا کہ شریفن اور اس کی ماں، یا پھر وہ

بیگم صاحبہ بھی جو کہانی کے ہر مشکل موڑ پر مشکل کشا بن کر آتی ہیں)۔اس طبقے کے لیے پردے کی پابندی ان کے خاندانی عزت ووقار کا لازمی جز وتھا۔اسی متوسط طبقے کے مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے محمدی بیگم نے یہ ناول تحریر کیا۔'' شریف بیٹی'' میں خواتین کو مضبوط بنانے کے لیے ایک ایسا مرکزی کردار پیش کیا گیا جس کے ذریعے خواتین میں حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے لیے مالی وسائل پیدا کرنے اور خاندان کو مضبوط کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔جبکہ اس دور کے دیگر ناولوں میں عورت کو ایک ایسی دیوی بنا کر دکھایا گیا جس کو گھر کے ایک کونے میں ڈھک کر رکھ دیا جائے جس پر حرکت وعمل کے سب دروازے بند ہوں۔گویا وہ گڑیا گھر میں بیٹھی گڑیا ہو جس کا کام چمکیلے کپڑے پہن کر دوسروں کو خوش کرنا اور ان کا دل بہلانے کے سوا کچھ اور مصرف نہ ہو۔اس ناول میں محمدی بیگم کے ناول ''صفیہ بیگم '' کی ہیروئین اپنے ارتقاء کے ساتھ سامنے آتی ہے۔صفیہ حالات کا سامنا کرنے سے قاصر نظر آتی ہے اور موت سے ہم کنار ہو جاتی ہے۔''شریف بیٹی'' کی ہیروئین کو بھی دکھ توڑتا ہے لیکن اس کے اندر غربت اور دیگر مسائل کے ساتھ مقابلہ کرنے کا حوصلہ اور جینے کی امنگ موجود ہے۔اس ناول کے ذریعے خواتین میں اپنی اور اپنے کنبے کی کفالت کر سکنے کا حوصلہ اور اعتماد دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

''شریف بیٹی'' پہلی مرتبہ ۱۹۰۸ء میں لکھا گیا،اس دور میں خواتین کے لیے نظامِ تعلیم وضع کرنے کی بحثیں جاری تھیں۔ذیل میں دو اقتباسات درج کیے جاتے ہیں جس سے گھروں کے اندر باقاعدہ سکول تو نہیں لیکن شریف بیبیوں کے لیے گھریلو مدارس کے پورے نظام کو سمجھا جا سکتا ہے۔

> ''تم یوں کرو کہ جو لڑکی تمہارے ہاں آئے اس سے پڑھائی کا روپیہ لو،(شریفن) یوں کرتے تو مجھے شرم آتی ہے۔لوگ مجھے ملانی کہیں گے۔''(۳۴)
>
> اہلِ محلّہ کو یہ شوق چڑھ آیا کہ جس طرح ہو شریفن کو اس بات پر رضا مند کیا جائے کہ وہ ہماری لڑکیوں کو پڑھا دیا کرے۔بعض نے تو اسے گھر بلا کر پڑھانے کے لیے اسے معقول تنخواہ بھی دینی کی۔مگر اس غیرت مند لڑکی نے کسی کے گھر جا کر استانی بن کر پڑھانے سے قطعی انکار کر دیا۔(۳۵)

محمدی بیگم کا ناول ''آج کل'' فنی حوالے سے ان کے پہلے تمام ناولوں سے زیادہ اہم ہے۔اس ناول کو واحد متکلم کے

انداز میں پیش کیا گیا ہے۔کہانی کا مرکزی کردار ایک سگھڑ، سلیقہ منداور تعلیم کے زیور سے آراستہ اور ظاہری خوبصورتی سے پیراستہ خاتون ''فہمیدہ'' کا ہے۔ یہ کردار ہر لحاظ سے مکمل ہے لیکن ایک عمومی عادت یعنی آج کا کام کل پر چھوڑنا کا شکار ہوتی ہے۔ یہ بظاہر معمولی سی عادت اس کی زندگی میں اسے ایک ایسے المیے سے دوچار کرتی ہے جہاں اسکی ہنستی کھیلتی زندگی قصۂ عبرت بن جاتی ہے۔

محمدی بیگم کا ناول ''آج کل'' واحد متکلم کی تکنیک میں لکھا گیا ناول ہے۔اس ناول میں ناول نگار کی فنی پختگی ان کے موضوع اور فن کے حوالے سے سنجیدہ تخلیقی کاوش کی کامیابی کی دلیل ہے۔اس ناول کا آغاز ایک ایسے قصے سے کیا جاتا ہے جس کی ابتدا میں سب کچھ بہت اعلیٰ اور مکمل دکھایا جاتا ہے۔ پھر وہ واقعات جو بظاہر معمولی اور روزمرہ کی زندگی کے معمولات کا حصہ ہوتے ہیں،ان کے ذریعے کہانی اپنے اندر ایک بڑے المیے کے لیے فضا سازگار کرتی ہے۔ بالآخر کہانی کی مرکزی کردار فہمیدہ جو اسم بامسمّیٰ بھی ہے لیکن ایک عمومی عادت یعنی آج کا کام کل پر ڈالنے کی وجہ سے زندگی کی ساری خوشیاں کھو بیٹھتی ہے۔

اس ناول میں بھی طبقۂ اشراف کے طرزِ زندگی کی جھلکیاں بڑی آسانی سے دیکھی جاسکتی ہیں۔

> ''وہ قابلیتیں کس کام آئیں گی جب گھر ہی برباد ہوگیا، کچھ ہوش کی خبر لو اور گھر بار کی طرف توجہ کرو، جاگیر الٹی جاتی ہے،لاکھ حکام میں آپ کی قدرومنزلت ہے۔مگر بھائی جان گھر بیٹھے پیروں کو بھی کوئی نہیں پوچھتا۔سینکڑوں جلسے،بیسیوں پارٹیاں حکام بالا سے لے کر عام پبلک تک کی ہوگزریں ،مگر آپ کی صورت کسی میں نظر نہ پڑی۔احکام بھی انہیں لوگوں کی قدر کرتے ہیں جو ہر وقت ان کے پیش نظر رہیں،ان کے جلسوں میں شریک ہوں''(۳۶)

ناول ''آج کل'' میں عمومی روش سے ہٹ کر اسلوب کی بجائے پلاٹ کی بنت کے ساتھ کہانی میں المیہ کو منطقی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ایک عام قاری چھوٹے چھوٹے واقعات کے اندر چھپے ہوئے کسی بڑے حادثے کی بازگشت بڑی آسانی سے سن سکتا ہے۔

اس ناول اس میں خواتین کرداروں کے پس پردہ حقوقِ نسواں یا خواتین کے ساتھ معاشرے کے استحصالی رویوں کو پیش نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کہانی کی مرکزی کردار فہمیدہ ایک فارغ البال خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔اسے گھر پر تعلیم

بھی دی جاتی ہے،اسی طرح جب شادی کا معاملہ آتا ہے تو اسے اپنے گھر سے بھی زیادہ آسودہ گھر نصیب ہوتا ہے جہاں خیال رکھنے والا شوہر اس کے ہر ناز ونعم اور آرام وآسائش کا بے حد خیال رکھتا ہے۔پھر قدرت اس پر مہربان ہو کر اسے خوبصورت اور صحت مند اولادِ نرینہ عطا کرتی ہے۔لیکن ان تمام آسائشوں کے نتیجے میں اس کی ایک عام عادت یعنی آج کا کام کل پر چھوڑنے کو اور تقویت ملتی ہے اور وہ اس قدر کاہل ہو جاتی ہے محض منہ سے حکم جاری کرنا بھی اسے محال ہو جاتا ہے۔ایک دن چھت کا جنگلہ جسے مرمت کروانے کے لیے اسے کہنے میں ایک دو دن لگ گئے اس پر سے اس کا بیٹا گر کر دارِ فانی سے کوچ کر جاتا ہے۔اس طرح یہ عام سی خامی اس کی زندگی کو تاریک کر دیتی ہے اور اس واقعے کے ردِ عمل میں اس کا شوہر دوسری شادی کر کے اسے پچھتاوے کے پہاڑ تلے دب کے موت سے ہم کنار ہونے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

اس کہانی کے تمام کردار بشری خامیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔فہمیدہ کا کردار بھی فہم وفراست کی اعلیٰ مثال ہے لیکن اس کی ایک معمولی خامی اسے زمین سے جوڑ دیتی ہے۔فہمیدہ کے شوہر کا کردار ابتدائی ناولوں کے روایتی کرداروں سے بالکل مختلف ہے۔اس کے مزاج میں عجز وانکساری ہے مگر بیٹے کی وفات اسے بیوی سے بددل کر دیتی ہے اور وہ عام جیتے جاگتے کرداروں کی طرح سخت ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔

یہ ناول اپنے اختتام پر ایک سبق آموز قصہ بن جاتا ہے۔مگر اس کے باوجود یہ ناول مکالماتی اندازِ بیان، ہیئت کے نئے تجربات اور کہانی میں واقعات کے منطقی اندازِ پیش کش کی وجہ سے کامیاب ترین ناول کہا جاسکتا ہے۔

خواتین کی زبان کا استعمال بھی ناول نگار نے بڑی فنی پختگی اور گہرے مشاہدے سے کیا ہے۔مصنفہ نے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والی خواتین کی زبان ان کے مطابق کمال مہارت سے پیش کی ہے مثلاً نائین کی زبانی مندرجہ ذیل مکالمے قابلِ توجہ ہیں۔

> ''مردووے کچھ دیوانہ ہوا ہے؟ دے دلا کر واپس لیتا ہے۔کیا واپسی
> کے اقرار پر دے گیا تھا؟ جا جا نالش کر۔بکری اب نہیں ملتی۔ہم کیا
> تیرے گھر لینے گئے تھے۔یا تجھ سے زبردستی لے لی۔ہوش کی دوا
> کر۔اب میں بچے کو رلواؤں اور بکری تجھے دوں۔'' (۳۷)

'آج کل' میں جو اسلوب پیش کیا گیا ہے وہ اس ناول کی جامعیت میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔خاتون ناول نگار ہونے کے ناتے محمدی بیگم مرکزی کردار فہمیدہ کے مکالموں کو بڑی روانی اور محاورات وضرب الامثال کے ساتھ جوڑ کر پیش

کرتی ہیں جس سے اسلوب میں برجستگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار فہمیدہ جس کا تعلق اشرافیہ سے ہے اس کے مکالموں سے اس کردار کا مقام و مرتبہ واضح ہو جاتا ہے۔

''یوسف صبح ہی صبح اٹھا اور بدستور اس جنگلے کے پاس جا کھڑا ہوا، اس کی انا نیچے بیٹھی تھی اسے تا تا کرنے لگا، کھلائی کمبخت نے جو اسے جنگلے کے پاس دیکھا تو چیختی پکارتی دوڑی۔ بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب ان کی طرف کوئی دوڑے تو وہ اور بھی گھبرا کر بھاگتے ہیں، آہ پیارا یوسف جو ناز اور خوشی سے کلکاری مار کر بھاگا تو میں کیا لکھوں اس سے آگے مجھ سے لکھا نہیں جاتا، یا تو میرا چاند بام پر تھا یا چشم زدن میں صحن کے پکے فرش پر پڑا نظر آیا'' (۳۸)

''وہ کہتے ہیں کہ اس نے آنکھیں کھولیں اور خوب اچھی طرح میری طرف دیکھا مگر پھر ایسی آنکھیں بند کیں کہ ناشاد ماں تڑپتی ہی رہ گئی اور اس نے آنکھ کھول کر اس کا حال دیکھا:

یہ کیسی نیند آ گئی الٰہی مسافران رہ عدم کو کچھ ایسے سوئے کہ پھر نہ اُٹھے

تھکے ہم ان کو جگا جگا کے'' (۳۹)

اسی طرح ''صفیہ بیگم'' میں بھی جب صفیہ نواب صاحب کے گھر جاتی ہے تو خواتین کے آپس کے مکالمے دلچسپ اور اپنی اپنی جگہ بڑی مہارت سے پیش کیے گئے ہیں محمدی بیگم کے ناولوں میں خواتین کا طرز بیان اپنی فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس دور کی زبان کا مزاج جاننے میں بھی بڑی مدد دیتا ہے۔ محاورات اور ضرب الامثال کا استعمال بھی بڑی برجستگی اور پوری ادبی چاشنی اور رچاؤ کے ساتھ ملتا ہے۔ ذیل میں درج اقتباسات میں معاشرتی رویوں کی جھلک بھی بآسانی دیکھی جا سکتی ہے۔

''سونے کے سہرے بیاہ ہو'' (۴۰) ''ماں باپ کو خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں ۔تمہاری ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رہے'' (۴۱) ''بیٹی ایڑھی دیکھ کر کہتی ہوں۔ صد رحمت تمہاری عقل پر'' (۴۲) ''عورتیں ایسی وہمی ہوتی ہیں کہ لیڈی ڈاکٹر کو بلانے نہیں دیتیں'' (۴۳) ''خدا آج میری شرم رکھ لے'' (۴۴) ''اس موئی فرنگن کو بلایا تھا'' (۴۵) ''عورتوں کی عقل اوندھی ہوتی ہے'' (۴۶) ''ایک دفعہ زبان دے چکی ہوں، اب چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو

جائے‘‘(۴۷)’’کسی نے اولاد کو کنوئیں میں ڈالا ہوتو میں بھی ڈال دوں‘‘(۴۸)’ہڈی میں ہڈی اور پیوند مل جائے‘‘(۴۹)’’جب جاہل تھا،اب عالم ہے،جینٹلمین ہے‘‘(۵۰)’’ہائے میرے خیالی پلاؤ یونہی پکتے رہے‘‘(۵۱)’’ہائے صفدر نے سونے کی چڑیا اڑا دی‘‘(۵۲)’’یہ سب تمہاری شیخ چلی کی سی باتیں ہیں‘‘(۵۳)’’میں اس صورت کی اتنی بھی پروانہیں کرتا جتنی اُڑ د پر سفیدی‘‘(۵۴)’’مجھے چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے‘‘(۵۵)’’تل دھرنے کو جگہ نہ تھی‘‘(۵۶)’’تھالی پھینکو تو سر پر ٹکے‘‘(۵۷)’’جس جگر کے ٹکڑے کو سولہ برس تک تعویذ کی طرح گلے لگائے رکھا‘‘(۵۸)’’اس قدر خوبصورت کہ ہاتھ لگائے میلا ہوتا تھا‘‘(59)’’مال مفت دل بے رحم‘‘(۶۰)’’اس اندھیری نگری میں خاک پلے نہ رہتا‘‘(۶۱)’’کاٹھ کی ہلکی پھلکی گاڑی بے پہیوں کے نہیں چلتی‘‘(۶۲)’’اگر میں پھوڑ۔جاہل۔بے تمیز ہوتی اور کچھ نہ کرتی‘‘(۶۳)’’کاہلی میری گھٹی میں پڑی ہوئی‘‘(۶۴)’’دیکھو اس کا نازک گلاب کے پھول سا بدن جوؤں کے کاٹنے سے کیسا ہو رہا ہے‘‘(۶۵)’’اس سے میرا ماتھا ٹھنکا اور میں مضطراب ہو کر تڑپی‘‘(۶۶)’خدا کی مرضی یہی تھی‘‘(۶۷)’’میرے کلیجے کا ٹکڑا یوں کاٹ کرنہ لے جاتے‘‘(۶۸)

شریفن کی ماں کی ادھیڑ بن کہیں نہ گئی (۶۹)بہتر ہے اپنے ہاتھ پاؤں ہلاؤں اور کچھ ناخونوں سے پیدا کروں۔(۷۰)’’یہ حالت ہوگئی کہ چار پائی سے لگ گئے(۷۱)’’وہ اپنا بوریا بستر لے کر ہمیشہ کے لیے عبدالغنی مرحوم کے گھر اٹھ آئی(۷۲)

’’بچوں کی بہاریں دیکھنی نصیب کرے اور اتنا دے کہ گھر بھر کر باہر بھرو(۷۳)اصل بھید کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو تی‘‘(۷۴)

محمدی بیگم کے ناول ان کے معاصر مرد ناول نگاروں کی نسبت خواتین کے معاشرتی رویوں کی زیادہ گہری، سادہ اور سچی تصویر کشی کرتے ہیں۔ان کے ناولوں میں اشراف،متوسط اور غریب تینوں طبقات سے تعلق رکھنے والی خواتین کے مسائل کو ان کے پس منظر میں رکھ کر سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔محمدی بیگم کے ناولوں میں مقصدیت کا رنگ بھی موجود ہے جیسا کہ خواتین کی تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنا، پڑھی لکھی اور ان پڑھ خواتین کے ساتھ روزمرہ کے معاملات اور مسائل کو پیش کرنا،اور خواتین کو اپنے لیے اور خاندان کے لیے کفالت کرنے کا حوصلہ دینا وغیرہ مگر کہیں بھی یہ مقصد وعظ یا نصیحت کے بوجھ سے کہانی کی دلچسپی کو نقصان نہیں پہنچا تا۔اس کی ایک وجہ ان کا اسلوب بیان ہے جس میں وہ تخلیقی آہنگ موجود ہے جو بڑی سے بڑی بات کو بھی روزمرہ اور محاورے کی زبان میں سمجھانے کا ملکہ رکھتا ہے۔تاریخ کسی دور کے بڑے واقعات کو بیان کرنے کی تو صلاحیت رکھتی ہے لیکن ادب میں کسی بھی دور کو اس کی

جزئیات کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر موجود ہے۔محمدی بیگم کے ناول بھی خواتین کی تحریکوں کے تہذیبی اور ثقافتی تناظرات میں سمجھانے میں بے حد معاون ثابت ہوتے ہیں۔

حوالہ جات وحواشی

۱: ''سرسید احمد خان کا جواب ایڈریس بخدمت خواتین پنجاب''
''اے میری بہنوں! میں اپنی قوم کی خواتین کی تعلیم سے بے پرواہ نہیں ہوں۔ میں دل سے ان کی ترقی کا خواہاں ہوں۔ مجھ کو جہاں تک مخالفت ہے۔ اس طریقۂ تعلیم سے ہے جس کے اختیار کرنے پر اس زمانے کے کوتاہ اندیش مائل ہیں۔ میں تمہیں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانا طریقۂ تعلیم اختیار کرنے کی کوشش کرو۔ وہی تمہارے لیے دین و دنیا میں بھلائی کا پھل دے گا اور کانٹوں میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا''
(ڈاکٹر شیخ عبداللہ، ''مشاہدات وتاثرات''، مرتبہ اطہر صدیقی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء، ص ۲۹۷)

۲: ڈاکٹر شیخ عبداللہ، ''مشاہدات وتاثرات''، مرتبہ اطہر صدیقی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء، ص نمبر ۳۰۰۔۳۰۱

۳: جے۔ای۔ڈی۔بیتھون (۱۸۵۷ء۔۱۸۰۱ء) پیشے کے اعتبار سے ایک اینگلو انڈین وکیل تھے، جو بیرسٹر بھی رہے، انہوں نے خواتین کی تعلیم کی کوششیں کیں۔ ۱۸۴۹ء میں خواتین کی باقاعدہ تعلیم کے لیے کلکتہ میں ایک ادارہ بنایا جو بعد میں بیتھون کالجز کے نام سے مشہور ہوا۔

۴: نسرین احمد، "Muslim Leadership and Women 's Education",
مطبوعہ Three essays collective، اشاعت اول، نیو دہلی، انڈیا، ۲۰۱۰ء، ص ۸

۵: ''حقوقِ نسواں'' میں مولوی ممتاز علی نے خواتین کے حوالے سے مذہب کی ذاتی تاویلیں پیش کر کے جس طرح ان کے حقوق کا استحصال کیا جاتا ہے، کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کتاب میں نوآبادیاتی ہندوستان میں جو توہمات (Stereo-types) خواتین کے حوالے سے پائی جاتی تھیں، ان کو بھی قرآن وحدیث کی روشنی میں رد کیا گیا ہے۔ قرآنِ پاک کی تفاسیر کا بھی اس ضمن میں جائزہ لیا گیا ہے کہ اصل لفظ یا آیت کا

مفہوم کیا ہے اور ہندوستانی معاشرے میں اس سے کیا مراد لیا جاتا ہے۔ مثلاً لفظ ''قوام'' کی مولوی ممتاز علی نے لغوی اور معنوی اعتبار سے جو تعبیر کی ہے اس کے معنیٰ ''حاکم'' کے نہیں بلکہ ''کارگزار'' کے ہیں۔ اسی طرح تعلیم کے حصول یا خواتین کے ناقص العقل کہے جانے کی آراء اور جائیداد میں سے خواتین کی بے دخلی کو قرآن وحدیث کی روشنی کے تناظر میں اس وقت کے ہندوستانی معاشرے کو سمجھانے اور ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب سے مولوی ممتاز علی کی طبقۂ نسواں کے لیے ہمدردی اور ان کے مسائل کو حل کرنے کے جذبے کو سمجھا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ وہ اپنے قول کی عملی تفسیر بھی تھے جس طرح انہوں نے اپنی بیٹی اور بیوی سے سلوک رکھا وہ مثالی ہے۔

۶: ''تہذیب النسواں'' کا باقاعدہ آغاز ۱۸۹۸ء میں ہوا۔ اشاعت سے پہلے چند مشاہیر کو اس کی اعزازی کاپیاں بھیجی گئیں تو جوابی لفافوں پر گالیاں موصول ہوئیں۔ اس رسالے کے اگرچہ سرسید احمد خان حامی نہ تھے مگر مجوزہ ناموں میں ''تہذیب الاخلاق'' کی طرز کا نام یعنی ''تہذیب نسواں'' ان کی رائے پر رکھا گیا۔

۷: جاوید اختر، سید ڈاکٹر، ''اردو کی ناول نگار خواتین''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۲۰

۸: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ''تاج صاحب کے والدین''، مشمولہ مجلّہ ''صحیفہ''، تاج نمبر، شمارہ ۵۳، اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص نمبر ۲۵

۹: محمدی بیگم کا ناول ''شریف بیٹی'' کے حوالے سے نیلم فرزانہ کی رائے صائب نہیں ہے کیونکہ اس ناول میں اصغری جیسا کردار ''شریفن'' تو موجود ہے لیکن اس میں کوئی بھی کردار اکبری کی طرح کا تخلیق ہی نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ کہانی یوں بھی منفرد ہے کہ اس میں صرف ہیروئین ہے اور اس کا مقابلہ غربت اور حالات سے ہے۔ نہ کوئی اس میں مرد ہیرو موجود ہے اور نہ کوئی منفی کردار۔

''شریف بیٹی' پر نذیر احمد کے ناول 'مرآۃ العروس'' کا اثر پورے طور پر نمایاں ہے۔ یہاں بھی اکبری اور اصغری کے مثل دو کردار انوری اور اختری کو وضع کیا گیا ہے۔ ایک اچھائی اور نیکی کا نمونہ ہے اور دوسرا اس کے برعکس۔۔۔''

(نیلم فرزانہ، اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار''، براؤن بک پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۸)

۱۰: گیل مینو، (The Secluded Scholars'' (Gail Minaual آکسفورڈ یونیورسٹی

پریس دہلی، انڈیا، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱۸

۱۱: انور شاہین :

"Patriarchal Education and Print Journalism: their emancipating of India
Pakistan Journal of History and مشمولہ during 1869-1908"impact on Muslim
Culture,Vol xxx,No.2, 2009

۱۲: عذرا اصغر علی: The emergence of Reformist Literature about Indian Muslim
(Women in Urdu Language) مشمولہ Pakistan Journal of History and Culture,Vol
xix,No.2, 1998

۱۳: سی ایم نعیم:"Meet Bibi Ashraf" مشمولہ روزنامہ ڈان، ستمبر ۷، ۲۰۱۵ء

۱۴: رؤف پاریکھ:" Literary Notes: Muhammadi and Tehzeeb i- Niswan
"مشمولہ روزنامہ ڈان، نومبر ۰۲، ۲۰۱۵ء

۱۵: "حیاتِ اشرف" بی بی اشرف النساء بیگم کی سوانح عمری ہے جسے محمدی بیگم نے تحریر کیا۔ بی بی اشرف بروز شنبہ غرہ شعبان ۱۲۵۶ ہجری مطابق ۲۸ ستمبر ۱۸۴۰ء کو ایک اہلِ تشیع گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن پر سنِ اشاعت درج نہیں البتہ زیرِ استعمال نسخے پر ۱۹۱۲ء درج ہے جو محمدی بیگم کے انتقال کے بعد مولوی ممتاز علی نے رفاہِ عام سٹیم پریس لاہور سے شائع کروایا۔

۱۶: محمدی بیگم نے بچوں کے لیے کئی نظموں اور لوریوں کی کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں "تاج گیت" (ننھے بچوں کے لیے آسان گیت)، "خوابِ راحت" (دہلی کی مشہور لوریاں)، "پان کی گلوری"، (پان کی تعریف میں ایک دلچسپ نظم)، شامل ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے بچوں کے لیے دو تصویری کہانیوں کے ساتھ سلیس اور دلچسپ کہانیاں بھی لکھیں۔ جن میں "امتیاز پچیسی" (پچیس آسان کہانیوں کا مجموعہ) اور "دلپسند کہانیاں" اور "علی بابا چالیس چور شامل ہیں۔ "تاج پھول"، "ریاض پھول"، چوہے بلی نامہ"، تین بہنوں کی کہانیاں" بھی بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے لکھیں۔

۱۷: محمدی بیگم نے خواتین کی تعلیمی ضرورتوں کے ساتھ ان کی تربیتی ضرورتوں کو بھی سمجھا۔ ان کو گھر بیٹھے ایک ایسی گائیڈ فراہم کرنے کی کوشش کی جس سے وہ سوسائٹی کے بدلتے ہوئے مزاج کو سمجھیں اور اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالیں۔ اس سلسلے میں ان کی کتاب "آدابِ ملاقات" زنانہ میل جول کے مہذب

طریقے، ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔اسی طرح ''رفیقِ عروس'' میں نئی دلہنوں کو نئے گھر میں جا کر سسرال میں کیسے میل جول رکھنا چاہیے،اس بارے میں مفصل رہنمائی کرتے ہے۔''سگھڑ بیٹی''، میں نو عمر لڑکیوں کی پرورش اوران کو معاشرے کا بہتر فرد بنانے کے طریقے درج ہیں۔''مشیرِ مادر'' میں ماؤں کو بچوں کی صحت کے مسائل سے لے کر ان کی تربیت کے لیے بھی رہنمائی دی گئی ہے۔

۱۸: ''خانہ داری'' اور ''نعمت خانہ'' میں خواتین کو کھانا پکانے، گھریلو معاملات کو احسن انداز میں چلانے کے طریقے بتائے گئے ہیں، واضح رہے کہ ''تہذیب نسواں'' میں بھی خانہ داری کے لیے بھی کچھ اوراق مختص کیے جاتے تھے۔

۱۹: محمدی بیگم، ''صفیہ بیگم''، باہتمام تاج وحجاب، دارالاشاعت پنجاب، لاہور، ۱۹۵۹ء، ۶

۲۰: ایضاً، ص ۹

۲۱: ایضاً، ص، ۸

۲۲: محمدی بیگم نے ان ناولوں کے علاوہ ایک قصہ ''چندن ہار'' کے عنوان سے بھی تحریر کیا، لیکن یہ طویل کہانی ہے اسے ناول نہیں کہا جا سکتا۔

۲۳: محمدی بیگم، ''صفیہ بیگم''، باہتمام تاج وحجاب، دارالاشاعت پنجاب، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۹۲

۲۴: ایضاً، ص ۳۸

۲۵: ایضاً، ص ۹۲

۲۶: حقوقِ نسواں میں مولوی ممتاز علی نے اس مسئلے سے بھی بحث کی ہے کہ اسلام شادی سے پہلے لڑکی اور لڑکے کو دیکھنے کی بھی اجازت دیتا ہے اور رضامندی کے لیے تو ہر حال میں پوچھے جانے کی تاکید کی گئی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے ایک کتاب ''اربعین'' میں ان احادیث کو بھی یکجا کر دیا جس میں معاشرے کی اصلاح کا پہلو تھا۔اس میں خواتین کے اکٹھے باجماعت مگر مردوں کی قطاروں کے پیچھے نماز ادا کرنے کا حکم ہے، کو حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔عیدین کے اجتماع میں شرکت، پردے کے متعلق بحث کو بھی زیرِ بحث اسلام کی رو سے پیش کیا گیا ہے)

۲۷: محمدی بیگم، ''صفیہ بیگم''، باہتمام تاج وحجاب، دارالاشاعت پنجاب، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۸۱

۲۸: ایضاً، ص ۲۷۔۲۶

۲۹: ایضاً،ص۱۰

۳۰: ایضاً،ص۱۱

۳۱: ایضاً

۳۲: ایضاً،ص ۱۷

۳۳: ایضاً،ص ۱۰

۳۴: محمدی بیگم،''شریف بیٹی''،مطبوعہ یونین سٹیم پریس لاہور،۱۹۱۸ء،ص۴۹

۳۵: ایضاً،ص ۴۷

۳۶: محمدی بیگم،''آجکل''،دارلاشاعت پنجاب لاہور،۱۹۲۰ء،ص۱۵

۳۷: ایضاً،ص ۳۸

۳۸: ایضاً،ص ۴۲

۳۹: ایضاً،ص ۴۴

۴۰ : ''صفیہ بیگم''،ص۶

۴۱: ایضاً،ص۶

۴۲: ایضاً،ص۷

۴۳: ایضاً،ص،۱۰

۴۴: ایضاً،ص،۱۴

۴۵ : ایضاً،ص۲۲

۴۶: ایضاً،ص۲۶

۴۷: ایضاً،ص،۲۷

۴۸: ایضاً،ص،۲۷

۴۹: ایضاً،ص،۴۵

۵۰: ایضاً،ص،۴۷

۵۱ : ایضاً،ص،۵۵

۵۲: ایضاً،ص،۵۸

۵۳: ایضاً،ص،۵۹

۵۴: ایضاً،ص،۶۹

۵۵: ایضاً،ص۸۰

۵۶: ایضاً،ص،۸۹

۵۷: ایضاً،ص،۸۹

۵۸: ایضاً،ص،۹۴

۵۹ : آجکل،ص۱۱

۶۰: ایضاً،،ص۱۲

۶۱: ایضاً،،ص،۱۴

۶۲: ایضاً،،ص۱۷

۶۳: ایضاً،،ص۱۶

۶۴: ایضاً،،ص،۱۷

۶۵: ایضاً،،ص،۱۸

۶۶: ایضاً،،ص،۳۷

۶۷: ایضاً،،ص۴۵

۶۸: ایضاً،ص۵۴

۶۹: ’’شریف بیٹی‘‘،ص،۲

۷۰: ایضاً،ص۲

۷۱: ایضاً،ص۱۶

۷۲: ایضاً،ص۲۰

۷۳: ایضاً،ص ۲۲

۷۴۔ ایضاً،ص ۴۸

ہمارا ایمان ہے کہ پائیدار ترقی معاشی ترقی پیدا کرتی ہے اور اسے منصفانہ طور پر تقسیم بھی کرتی ہے۔ پائیدار ترقی ماحول دوست ہے اور اسے خوشگوار بناتی ہے اور لوگوں کو بے بس اور بے اختیار کرنے کی بجائے انہیں با اختیار بناتی ہے۔ یہ لوگوں کو ترجیح دیتی ہے، ان کے حقِ انتخاب اور مواقع میں اضافہ کرتی ہے۔ یہ ترقی غریب نواز اور فطرت نواز ہے، روزگار کے حق میں ہے، خواتین کے حق میں ہے اور بچوں کے حق میں ہے۔

- پالیسی انسٹیٹیوٹ برائے پائیدار ترقی ایک آزاد، غیر منافع بخش، غیر حکومتی تحقیقی ادارہ ہے جو حکومتی، غیر حکومتی، شہری اور سیاسی تنظیموں اور عام لوگوں کو پالیسی مشورے دینے کے نقطہ نظر سے قائم کیا گیا ہے۔

- ادارے کا نصب العین، اقتصادی اہداف، ماحولیاتی دباؤ اور سماجی انصاف کے مابین مطابقتوں اور مسابقتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے پائیدار اور منصفانہ ترقی کی جانب سفر کو مہمیز دینا ہے۔

- عمومی سطح پر انسٹیٹیوٹ، پائیدار ترقی کے موضوعات کو قومی اور بین الاقوامی کاوشوں اور مباحث میں شامل کرنے کا خواہاں ہے، اس بات کا عملی اظہار حکومت اور دوسری تنظیموں کو قوانین کی تشکیل اور موزوں اداروں اور اطلاعاتی نظاموں کے فروغ میں مدد دے کر ہوتا ہے۔

پائیدار ترقی میں ظاہر کئے جانے والے خیالات، لکھنے والوں کے اپنے ہیں اور پالیسی انسٹیٹیوٹ برائے پائیدار ترقی (ایس ڈی پی آئی) کا بحیثیت ادارہ ان سے اتفاق ضروری نہیں۔